رفعت سراج
billoo

ترتیب

۱۔ دامنِ دل کو بچائیں کیا ۷

۲۔ عشق کو عشق سمجھ ۱۷

۳۔ رائیگاں تو ہے ۵۱

۴۔ نولکھا ہار ۸۱

۵۔ بند دروازہ ۱۰۱

۶۔ سوال ۱۲۰

۷۔ کستوری ۱۴۱

دامن دل کو بچائیں کیا۔

اس وقت میں پوسٹ مین تھا جب میں نے اس لڑکی کو پہلی بار دیکھا تھا۔ میری یادداشت میں آج بھی وہ سیاہ گیٹ محفوظ ہے جس کے سامنے جب میں اپنی سائیکل روک کر گھنٹی بجاتا تو وہ بھاگتی ہوئی آتی تھی۔ اور اس کی جلد بازی کا اندازہ مجھے اس بات سے ہوا کہ بعض اوقات وہ دوپٹے کی جگہ کوئی تولیہ یا غلاف وغیرہ قسم کی کوئی چیز شانے پر پھیلائے ہوئے تھی۔ ایک مخصوص ایروگرام جو دوسری ڈاک کے علاوہ ہوتا تھا۔ شاید کسی یورپی ملک کا ہوتا تھا۔ نام مجھے یاد نہیں آرہا۔ بہرحال کبھی یہ ایروگرام رجسٹر ہوتا تھا۔ کبھی عام ڈاک سے۔ مگر وہ پاگلوں کی طرح دوڑ کر آتی اس نے کبھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔..... ایروگرام اور دوسری ڈاک لے کر وہ ایروگرام کو بے صبری سے چیرتی پھاڑتی واپس ہوجاتی۔ وہ اس قدر دل کش وسادہ تھی کہ میں، جس کا واسطہ تقریباً" ہر روز ڈاک کی منتظر حسینہ سے پڑجاتا۔ اسے دیکھتا رہ جاتا۔ دیکھنے کا انداز ہوتا تھا۔ یہ خود اس پری پیکر کی اداؤں پر منحصر تھا۔ اگر وہ ایروگرام لے کر بالکل ہی بے خبر ہوجاتی تو میں پوری آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا ہوا سائیکل آگے بڑھا دیتا تھا۔ اور اگر کبھی وہ حاضر دماغی سے ڈاک وصول کرتی تو چور نگاہوں سے تکنے ہی پر اکتفا کرلیا کرتے تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کا پروقار مغرور سا انداز و بے نیازی جو کسی کمتر کے لیے کسی برتر کا عطیہ ہوتی ہے اور اس کے عالی شان گھر کی امارت مجھے دوبارہ اپنے جامے میں ڈال دیتی تھی۔

کبھی اس سیاہ گیٹ والے گھر کی ڈاک نہ ہوتی تھی تب میں شرارت سے رک کر گھنٹی بجا دیا کرتا تھا۔ اور اسے دوڑتا دیکھ کر بظاہر بے نیاز بنا سائیکل چلاتا گزر جاتا۔

اور پھر وہ لڑکی مجھے اچھی طرح زبانی یاد ہوگئی۔ میں نے اپنی اس ملازمت کے دوران بڑے بڑے ڈاک کے منتظر بے صبرے دیکھتے تھے۔ مگر وہ ایک ہی یکتا ولا ثانی نکلی۔

ایک روز وہ کالج یونیفارم میں ملبوس کتابیں اٹھائے شاید کالج سے واپس آرہی تھی میں اس کے گھر سے کافی دور ایک گھر کے سامنے کھڑا پارسل کے سلسلے میں دستخط لے رہا تھا کہ وہ چلی آئی۔

(میں اس کی کھنک دار آواز کو کیسے بھلا دوں)

"سنو پوسٹ مین 'حماد منزل کی ڈاک ہے؟"۔

گویا اس بے صبری کے لیے پانچ منٹ بھی زیادہ تھے۔ وہ یہیں سے ڈاک لے جانا چاہتی تھی۔ مگر افسوس! اس روز حماد کی ڈاک نہ تھی۔ ایک تو وہ لڑکی اس قدر لاپرواہ اور پر اعتماد تھی کہ اسے اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی اس کی حرکتوں سے حظ اٹھا رہا ہے یا مسکرا رہا ہے۔

"نہیں" میں نے افسوس سے سرہلا دیا۔

اپنی مترنم آواز سے وہ بہت زیادہ مہذب و پڑھی لکھی لگتی تھی۔ خاص طور پر اس کا "سنو پوسٹ مین" کہنا مغرورانہ انداز کے باوجود بہت پیارا و منفرد لگتا تھا۔

اور پھر میری ڈیوٹی دوسرے ایریا میں لگ گئی۔ میری جگہ اس ایریا کے لیے دوسرا پوسٹ مین آگیا مگر مجھے وہ اپنے نام کے ساتھ یاد رہی' جانے کیوں۔ حالانکہ اس کی بے تابی' بے صبری اور انتظار نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ ایروگرام اسی کے نام پر ہوتا تھا۔ باقی ڈاک زیادہ تر حماد احمد بیرسٹر کے نام ہوتی تھی۔ ایروگرام پر اس کا نام بڑے خوب صورت انداز میں لکھا ہوتا لکھنے والے باوالی کی انگریزی کی لکھائی حد درجہ خوب صورت تھی۔ اس پروگرام کی وصولی رسید پر اسکے ہی دستخط ہوتے تھے۔ بہرحال وہ کافی عرصہ یاد رہی اپنی "سنو پوسٹ مین" کی بازگشت کے ہمراہ۔

پوسٹ آفس کی ملازمت سے گزارہ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو رہا تھا۔ تب اپنے ایک جگری یار کے کہنے پر ڈرائیونگ سیکھ لی اور لائسنس ملتے ہی باقاعدہ ڈرائیونگ شروع کردی۔ پہلے پہل تو پرائیوٹ بس سروے سے ملازمت شروع کی "کنٹریکٹ کیریر" میری بس کی پیشانی پر سجا ہوتا اور میں ایک مقامی کالج کے ماتھے پر میرا مطلب ہے گیٹ پر۔

ایک روز بس کے مالک کو کالج کی پرنسپل نے بلا بھیجا۔ معلوم ہوا کہ سائنس گروپ کی طالبات کے لیے کوئی پوائنٹ نہیں۔ ساڑھے تین بجے سہ پہر کے لیے بھی پوائنٹ ہونا چاہیے کہ بعض مخصوص علاقوں کی طالبات کو شام ہوجانے کی وجہ سے کافی پریشانی ہوئی ہے۔ بعض اوقات امتحانات کے نزدیک دنوں میں طالبات کافی دیر تک پریکٹیکل کرتی ہیں۔

قصہ مختصر! میری ڈیوٹی ساڑھے تین بجے والی پوائنٹ پر لگادی گئی۔ میں یہ سن کر سخت بور ہوا تھا۔ دوپہر کو ہم سارے پوائنٹس کے ڈرائیور گپ شپ لگا کر وقت پاس کر لیتے تھے ایک تو لڑکیاں ایک ساتھ بھی تو اکٹھی باہر نہیں آتی تھیں۔ چہلیں کرتی۔ آرام سے چلتی کوٹ چادریں اتارتی۔ پہنتی باہر آتیں کہ اتنی دیر میں آدمی ایک نیند لے لے۔

میں ڈیوٹی کے پہلے روز تین بج کر بیس منٹ پر ہی کالج پہنچ گیا۔ کافی دیر سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر چند طالبات کو گیٹ کی سمت دیکھا۔ بس کو دیکھ کر ان میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ تھوڑا سا شور ہوا۔ شاید یہ ان کے لیے خلاف توقع بات تھی۔

آنے والی لڑکیاں خالی بس دیکھ کر کھڑکیوں کے ساتھ والی سیٹوں کی طرف دوڑیں کچھ وفاداروں نے اپنے برابر کی سیٹوں پر کتابیں رکھ کر ریزرو کیں اور لگیں پٹر پٹر باتیں کرنے۔ پوسٹ مین ہوئے' ڈرائیور ہوئے۔ ان کے سامنے کوئی راز داری نہیں برتی جاتی۔ انہیں مشینی آدمی سمجھ کر لوگ اپنی باتیں کئے جاتی ہیں۔ جیسے سامنے بیٹھا ہوا شخص آنکھ کان سے پٹ ہو اور یہ خاص طور پر کالج اسکول کی لڑکیاں تو ایک دوسری کے عشق میں بری طرح کھو جاتی ہیں۔ ذرا دیر جو زبان کو بریک لگالیں۔ اپنے اسٹاپ پر اترتے اترتے خدا حافظ کہتے کہتے بھی جانے کتنے قصے کو تاہ کرکے سنا جاتی ہیں۔ واقعی انسان کا ہر نیا اٹھتا قدم ایک نئے تجربے کا نیا زینہ ہوتا ہے۔

بس کافی بھر چکی تھی۔ میں نے کالج پر نگاہ ڈالی۔ تب میں بری طرح چونک اٹھا۔ ایک ساتھی لڑکی کو کتابیں تھما کر وہ اپنا ہیٹی کوٹ اتار رہی تھی۔ ساتھ ہی اڑتے دوپٹے سے "پردہ داری" بھی کر رہی تھی۔ ایک تو دوپٹہ سنبھالتی عورتیں مجھے ہمیشہ پردہ داری کم اور پردہ کشائی زیادہ کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ بہرحال اس کے دوپٹے سے نظریں ہٹا کر اس کے چہرے پر ٹکا دیں۔ وہ بس میں چڑھی سیٹ

دیکھنے کے دوران اس کی نظر مجھ پر بھی پڑی۔ مگر وہاں کوئی شناسائی کی لہر نہ تھی اس کا کھویا کھویا انداز جھکی جھکی آنکھیں دیکھ کر مجھے اس ان دیکھے شخص سے حسد محسوس ہوا جس نے اس کو ان حالت کو پہنچا دیا تھا۔ بس اپنے ہی قابل رکھ کر چھوڑا تھا سسرے نے..... کہ ادھر ادھر دیکھتی ہی نہیں۔ میں نے جھلا کر سگریٹ کا ٹوٹا باہر پھینک کر بس چلا دی۔

اس روز وہ ڈرائیونگ سیٹ کے سامنے میرے بائیں ہاتھ پر اپنی اکلوتی ساتھی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بعد میں دو اور لڑکیاں بھی ان کے برابر میں بیٹھ گئی تھیں۔ بس کافی خالی تھی کافی دیر انتظار کرنا تھا۔ مجھے ایک دم شرارت سوجھی۔ پرائیوٹ بس تھی ڈیک وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ کم آباد علاقوں سے جب گزرتا تو کیسٹ لگا لیا کرتا تھا جب سے سختی شروع ہوئی تھی۔ کیسٹیں وغیرہ کم ہی بج رہی تھیں۔ میں نے اس کی ایک نگاہ کی خاطر شرارت کر ڈالی۔

اے نرگس مستانہ بس اتنی شکایت ہے
سمجھا ہمیں بیگانہ بس اتنی شکایت ہے

تب اچانک شور پر کتر کتر کرتی زبانوں پر بریک لگ گئے۔ نظریں میری طرف اٹھیں ان میں وہ نظریں بھی شامل تھیں جن کی پردہ کشائی کی چاہ تھی۔ رفیع کی شرارت بھری آواز اور میری مسکراتی نظریں جو ہر لحظہ اسی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اسے بوکھلانے کے لیے کافی تھیں۔

ہر راہ پہ کترائے ہر موڑ پہ گھبرائے
منہ پھیر لیا تم نے ہم جب بھی نظر آئے
ہم کو نہیں پہچانا بس اتنی شکایت ہے

تب اس کی غیر ارادی اور الجھی ہوئی نظریں دوبارہ اٹھیں۔ یہاں وہی مستقل مزاجی بھی تھی۔ یعنی میں برابر اچٹی نظر اس پر ڈال رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ بنتی ہے۔ وہ ورنہ وہ مجھے پہچانتی ہے۔ تب حسن میری اس گستاخی پر برہم ہو گیا تھا۔ یقیناً" اس نے اور دیگر طالبات نے مجھے بازاری قسم کا عاشق مزاج نوجوان سمجھا۔ اس جرائت میں میری ازلی خود اعتمادی بھی برابر کی مجرم تھی۔ مجھے اپنی اٹھان و صورت کے متعلق کافی خوش فہمی تھی۔ ویسے درحقیقت میں اپنے بشرے

سے معقول آدمی ہی نظر آتا تھا۔ سرخ و سفید رنگت پر گھنی مونچھیں جنہیں میں تقریباً" روز سنوارتا تھا۔ اس وقت بھی اپنے کسرتی بدن پر سیاہ کرتا شلوار سجائے کہنیوں تک آستینیں چڑھائے محنتی و مضبوط بازو اسٹیئرنگ پر جمائے حسینوں کے جھرمٹ میں بڑی بہادری سے بیٹھا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خود پر طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد مجھے خوش فہمی حقیقت سے قریب لگی۔

غربت و حالات نے آج مجھے یہاں پہنچا دیا تھا شاید میں اپنے سنجیدہ و حساس ذہن کے ساتھ یہاں نہ ہوتا کسی تعلیمی ادارے کا سنجیدہ محنتی طالب علم ہوتا۔ قدرت نے مجھے باپ کے مرنے کے بعد ہی گھر کا مقتدر اعلیٰ بنا دیا تھا۔ میری سوچیں بھٹک گئیں۔ میں نے اپنی موجودہ حیثیت کو یاد کر کے ایک آہ سرد کھینچی اور کچھ دیر پہلے کی باتیں بھلا کر ونڈ اسکرین پر نظریں جما دیں۔

اس روز وہ بس میں چڑھی تو بس کافی بھر چکی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے پھنس کر کھڑی ہو گئی تب میں نے اس کے جرنلز..... اور فائل کی سمت ہاتھ بڑھا کر کہا "لائیے میں انہیں ادھر رکھ دیتا ہوں"۔

لیکن اس کے ساتھ مجھے دوسری کھڑی ہوئی لڑکیوں کی کتابیں بھی لینا پڑیں۔ ورنہ یہ انفرادیت شاید اسے مہنگی پڑتی۔ دراصل میرا انداز بھی تو اس سے اپنائیت کا جان پہچان والوں کا ہو جاتا تھا۔ فائل پر چٹ چپکی ہوئی تھی جس پر اس کا نام اور کلاس کا نام لکھا تھا وہی نام جو ایروگرام پر ہوتا تھا۔

اور پھر میں نے آئینے میں ایک اچٹتی نظر ڈالی تھی جس میں اس کے سرخ سرخ رخساروں والا چہرہ بہت بے نیاز و سادہ تھا۔ میں نے بس چلا دی تھی اس اس کی قربت مجھے پاگل کیے دے رہی تھی۔ کتنا فاصلہ تھا ہم دونوں میں 'ایک ڈرائیونگ سیٹ کی پشت کا۔

دو مرتبہ لڑکیوں نے کسی چوک پر واویلا مچا دیا تھا ایک موڑ پر زبردست جھٹکے سے وہ آگے جھک آئی۔ (اور بھی جھکی ہوں گی مگر مجھے تو اس کا دھیان تھا) اس کا دایاں ہاتھ دھپ سے میرے کندھے پر پڑا۔ ساتھ ہی اس نے جھلا کر کہا تھا۔

"کیا مصیبت ہے"

میں نے آئینے میں دیکھا۔ وہ دوپٹہ کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ چہرہ غصے سے تپ گیا تھا۔

پیچھے سے لڑکیاں چیخی تھیں۔

"اے بھائی" اے بھیا ڈرائیور کم از کم ایک ڈگری کا گنہگار تو ہونے دو۔ تاکہ جانے والا منہ ہو جائے اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ سکیں کچھ تو کر آئے"۔

ساری لڑکیاں اس شوخ جملے پر جو نہ جانے کس طرف سے آیا تھا کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں مگر اس کے تیور سیدھے نہ ہوئے تھے۔ بلاشبہ وہ کھردری اور مغرور لڑکی تھی۔ یا شاید اسے یہ احساس ہو گا کہ میں اسے آئینے میں دیکھ رہا ہوں گا۔

ایک روز شاید کوئی تقریب تھی۔ کالج میں لڑکیوں نے کہہ دیا تھا کہ کل پانچ بجے بس لے آنا۔ یہ پوائنٹ ہی دراصل اس گروپ کے لئے مخصوص تھا۔ مگر دوسری جماعتوں کی لڑکیاں بھی پوائنٹ مس ہونے کی وجہ سے اس میں بیٹھ جاتی تھیں۔ اس دن بس کا بہت برا حال ہوتا تھا۔ تب میں نے کہا تھا کہ یہ تو مالک پر منحصر ہے اگر اس نے ٹائم تبدیل کرنے کی اجازت دے دی تو لے آؤں گا۔ اور یہ اتفاق تھا کہ بس کہیں بک نہیں تھی۔ میں بس لے کر پونے پانچ بجے کالج پہنچ گیا تھا۔ پورے کالج میں رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ کالج بھی سجا ہوا تھا خدا معلوم کیا ہنگامہ تھا۔

پانچ کے ساڑھے پانچ پھر پونے چھ ہو گئے، مگر اب میں انتظار کرتے ہوئے گھبراتا نہ تھا تب میں نے دیکھا وہ کلیجی سے رنگ کے شلوار قمیض میں چھوٹا سا پرس سینے سے لگائے لڑکیوں سے باتیں کرتی باہر آ رہی تھی۔ شہزادیوں کی آن بان سے۔

مرعوب ہو کر میں نے دونوں بازو اسٹیرنگ پر جما کر سر جھکا دیا۔

کافی دیر گزر گئی۔ آج کالج کے باہر موٹر کاروں کا بھی ایک طویل سلسلہ تھا بہت ساری لڑکیاں اور ان کی استانیاں اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ رہی تھیں۔ ان میں ایک نیلی موٹر کار میں وہ بھی بیٹھ چکی تھی۔ اس نے بھی شاید آج گھر سے گاڑی منگوائی تھی۔ اور مجھے اس کے سوا کچھ یاد نہیں کہ میں نے ایک شدید جھٹکے سے بس اسٹارٹ کی تھی۔ گاڑی کا گیر بدل کر گاڑی کو پانی کی روانی سے سڑک پر چھوڑ دیا تھا۔

اور پھر مجھ پر قیامتیں گزر گئیں۔ بس کا ایک شدید حادثہ تھا۔ میں ایک صنعتی علاقے میں دوا ساز

کمپنی کے ملازمین پہنچا کر بس واپس لا رہا تھا۔ کہ بھوسے سے بھرے ہوئے ایک ٹرک سے ایک موڑ پر میری بس ٹکرا گئی تھی۔ بس اتنا یاد ہے کہ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ ٹرک میرے سینے پر چڑھ دوڑا ہے اس کے بعد میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد میں ہوش میں آیا تھا میرا پورا بدن پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ہزار شکر کہ میرے تمام اعضا سلامت تھے۔ مگر دائیں ہاتھ کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اس پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ ہڈی جڑ جائے گی۔ میں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا مجھے اپنے زندہ بچ جانے پر حیرانی تھی۔

مہینوں بعد جسم پٹیوں سے آزاد ہوا۔ مگر دایاں ہاتھ پہلے کی طرح طاقت ور نہ تھا کافی محنت لیتا تھا کام میں۔ میں ڈرائیونگ نہ کر سکتا تھا بس کی نوکری بھی ختم ہو گئی۔ گھر میں فاقے ہونے لگے تب میں بھیک کے سوا ہر کام کرنے پر تیار ہو گیا۔

آخر کار دنوں کی مار ماری کے بعد پھر قدرت نے رزق کا اہتمام کر دیا۔ میں ایک ہاسپٹل میں وارڈ بوائے کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔ تنخواہ اچھی نہ سہی غنیمت تھی دو بھائیوں اور ماں کے ساتھ گزارہ ہو رہا تھا۔ بھائی پڑھ رہے تھے۔ ناکاموں کو کامیابی کے لفظ سے عشق ہوتا ہے مجھے بھی تھا اور ہے اور میرے بھائی میرے وجود کا حصہ ہیں۔ ان کی خواہشات کی تکمیل کوئی احسان نہیں تھا۔

بڑے ڈاکٹر صاحب نے کافی دیر ہوئی بلایا تھا وہ بھی معمول کی چہل قدمی کے بعد اپنے روم میں جا چکی تھی۔ اسے ہاسپٹل میں پانچواں دن تھا۔ چار روز قبل میں اسپتال کے اسی طویل برآمدے سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے اسٹریچر آتے دیکھ کر ایک طرف کو ہو گیا تب معلوم ہوا کہ مریض نہیں مریضہ ہے اور ابارشن کا سانحہ ہے۔ روز ہی ایسے معمولات ہوتے تھے۔ یہاں تو میں تو عادی ہو چکا تھا۔ لاپروائی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ مگر کل جب اسے ٹہلتے دیکھا تھا تو بری طرح چونک گیا تھا۔ چاند گہنا گیا تھا وہ بالکل وہی تھی میں اسے ہزاروں میں آسانی سے پہچان سکتا تھا۔

ابھی زندگی میں حادثات کی آمد و رفت تھی۔ یہ تھمتے تو شاید سہرا بھی سج جاتا۔ تنہائیوں میں کبھی کوئی دھیان میں پڑتا تھا تو مگر یہ وہ تو ہرگز نہ تھی۔ حسین، بے نیاز، مغرور، روکھی، آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتی نحیف و نزار کمزوری اور زردی۔

تب میں ضبط نہ کر سکا تھا۔ تیز تیز چلتا ہوا اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس نے ایک لمحہ کو سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا اور پھر ٹہلنے لگی تھی۔ جب میں رُک کر مسلسل اسے دیکھتا رہا۔ تب وہ میری اس ناگوار حرکت پر رُک کر سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی تھی۔ وہی پر اعتماد، مغرور نگاہیں جو امیروں کا خاصہ ہوتی ہیں [illegible]

"آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟" اس نے دھیمی آواز میں مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں بوکھلا گیا تھا۔ اب تو کچھ پھوٹنا ہی تھا۔ [illegible]

"وہ...... وہ جی آپ مس فوزیہ حماد ہیں نا جی۔ وہ دراصل" تب اس نے چونک کر میرے سراپے کا جائزہ لیا۔ [illegible]

"مس نہیں ہوں شادی شدہ ہوں۔ مسز فوزیہ شہرنواز۔ یہ نام جو تم ابھی لے رہے تھے یہ شادی سے پہلے میرا نام تھا اب نہیں۔ تم مجھے کس طرح جانتے ہو۔ میں تو تمہیں نہیں جانتی تھی"

اس نے دھیمے دھیمے لہجے میں بولنے کے دوران واکنگ جاری رکھی۔ وہی مغرور اور کھردرا سا لہجہ گویا بل ابھی باقی تھے۔ نہ جانے کیوں میں اس قدر دکھی ہو گیا تھا کہ وہ مجھے نہیں جانتی۔ پورے چھ ماہ اس کے خط پہنچائے تھے۔ پورے دس ماہ بس چلائی تھی گو کہ ان باتوں کو تین سال بیت چکے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ میں یہ سن کر کیوں دکھی ہوا کہ وہ مجھے نہیں پہچانتی کہ ہمیں وہی یاد رہتے ہیں جنہیں ہم یاد رکھنا چاہیں یا چاہتے ہیں ورنہ ہم ملتے کس کس سے نہیں۔

اور جو نام اس نے اپنے نام کے ساتھ لگایا یعنی شہرنواز یہ اسی ایروگرام کے "سینڈر ایڈریس" کے نیچے لکھا ہوتا تھا جس کا انتظار یہ سنگ دل جادوگرنی دیوانوں کی طرح کرتی تھی یہ نام آج بھی میرے حافظے میں موجود تھا۔ اس نام کے علاوہ میں نے آج تک کسی سے حسد نہیں کیا تھا۔ مگر میں درست ہی سمجھا تھا۔

"وہ بھی تم نے جواب نہیں دیا کہ آخر تم مجھے کس طرح جانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کوئی شناسائی کی لہر کوئی پہچان کی کرن کچھ بھی تو نہ تھا۔ میں کیا بولتا وہ اب بھی بڑی تھی۔ اونچی تھی، برتر تھی ایک امیر زادی تھی۔ اور میں...... ایک حقیر سا وارڈ

بوائے۔

"وہ جی پہلے میں پوسٹ مین تھا تو آپ کے گھر خط پہنچاتا تھا۔ میرا مطلب ہے آپ کے ایریئے میں تو جی آپ کے نام سے خط ہوتے تھے۔ اور آپ ہی خط لے کر جاتی تھیں"

مجھے کچھ تو بولنا ہی تھا سو اتنا کہہ دیا۔ جس پر اس نے سر ہلا کر بے نیازی سے کہا تھا۔

"اوہ! اچھا اچھا، بھئی بڑا تیز حافظہ ہے"۔

ڈرائیونگ والا دور بتانے سے میں نے خود گریز کیا کہ "پوسٹ مین" کا ماضی "ڈرائیور" کے ماضی سے زیادہ شریف تھا۔

لگتا ہے کوئی کام وام نہیں ہے تمہارے پاس بڑی غیر اہم باتیں یاد رکھتے ہو" وہ مغرورانہ لہجے میں جھاڑ کر دوبارہ ٹہلنے لگی تھی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید وہ مجھ سے پوچھے گی کہ وہ نوکری کیوں چھوڑی؟ اسپتال میں کیسے آئے؟ مگر اس نے تو اپنی عادت کے عین مطابق، مجھے نظر انداز کر دیا تھا میں کھسیا کر سر کھجاتا ہوا واپس ہو لیا تھا۔

آج شام میں اس کے روم کے سامنے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اس کے ساتھ اس کی آواز آئی۔

"شہری! شہری! پلیز میری بات تو سنیں"

"سناؤ......"

"ناراض ہو کر جا رہے ہو؟"

"بہت خوش کرنے والی باتیں کرتی ہو۔ آج فرصت ملی تو آگیا۔ اب میں تمہارا ملازم تو نہیں ہوں کہ ہمہ وقت جی حضوری میں لگا رہوں پیٹ پالنا ہے۔ تمہارے والد صاحب تو دے نہیں دے گے مجھے بیٹھے بٹھائے تنخواہ"

میں یہ کب کہہ رہی ہوں۔ آخر میں آپ کی بیوی ہوں۔ اتنے بڑے دکھ سے گزر رہی ہوں مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ آپ کی ذات کی۔ آواز پر آنسو غالب آگئے تھے۔

"ان آفتوں میں تم جان بوجھ کر پھنسی ہو۔ اب بھگتو مجھے کچھ وقت کیتھی اور بچوں کو بھی دینا

پڑتا ہے۔ آخر وہ میرے بچوں کی ماں ہے" آواز رک گئی چند لمحوں بعد پھر سنائی دی۔

"تم نے مجھے کیا دیا ہے؟ ذہنی کوفت اور تین سال میں دو ابارشن"۔

"شہری! اپ پر پہلے میرا حق ہے آپ میرا نام ساتھ لے کر امریکہ گئے تھے" ہچکیاں اور سسکیاں۔

"میں کسی کی جائیداد یا زمین نہیں جس پر حق جتایا جائے میرے ذات پر میرا حق ہے۔ صرف اور اتنا حق بھی تمہیں اس وقت تک حاصل ہے جب تک میں یہ حق تمہیں دے دوں۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ دار تم خود ہو۔ ٹھیک ہے کہ میں نے کیتھی سے اپنی شادی بزرگوں سے چھپائی مگر تم پر تو یہ سب ظاہر کر دیا تھا اور کہا تھا کہ تم خود انکار کر دو جس پر تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں ہر حال میں قبول ہوں۔ اب مجھ میں کیا کیڑے پڑ گئے ہیں"

بے وفائی اور ڈھٹائی کا عجیب نمونہ تھا۔

"شہری! میرے حال پر رحم کرو مجھے تمہاری محبت چاہیئے۔ طعنے نہیں دیکھو کیا حال ہو گیا ہے میرا"

سسکیاں گھٹنے لگیں۔

"پوچھنے تو میں تمہارا حال ہی آتا ہوں مگر تم اس قدر شور مچانے لگتی ہو کہ میں ذہنی کوفت میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ اپنا خیال رکھا کرو۔ اچھی طرح فروٹنگ کرو۔ ڈاکٹر بتا رہے تھے کہ دو تین دن لگیں گے۔ ڈسچارج ہونے میں۔"

بولنے والے کا لہجہ یکلخت نرم پڑ گیا۔ چند منٹ کے بعد دروازہ کھلا بولنے والا باہر آ گیا۔ میں بوکھلا کر سگریٹ سلگانے کے بہانے ہاتھوں کی اوک پر جھک گیا۔

اب اس شک کے بوٹوں کی آواز ہلکی ہو رہی ہے۔ وہ کافی دور بڑھ گیا ہے۔ میں سر اٹھا کر اس شاندار اور خوبصورت آدمی کو دیکھ رہا ہوں۔ جو شاندار سی موٹر میں بیٹھ رہا ہے اپنی ذات کے بٹوارے کے باوجود اس کا اطمینان قابل رشک ہے۔ میرے کانوں میں ایک آواز تھی۔ گھنٹیاں بجا رہی ہے۔

"سنو پوسٹ مین' حماد منزل کی ڈاک ہے آج؟"۔

عشق کو عشق سمجھ

"امی! چھوٹی ممانی آئی ہیں۔ اسماء نے دروازے سے جھانک کر اطلاع بہم پہنچائی

"ہائیں.... کیسے آ گئیں بھابی آج؟۔" انہوں نے تعجب سے گویا خود سے خطاب کیا تھا۔

"اور تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا۔ بے وقوف ہے یہ تو ایک دم۔" ان کے تو جیسے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ چٹخنی گرائی تو واقعی سامنے بھاوج کھڑی تھیں۔

"السلام علیکم بھابی!۔" ارے سجاد' حماد بھی آئے ہیں۔ ارے بڑی بھاگوان گھڑی ہے"

"آداب پھوپھو!۔ بڑے بچے نے شائستگی سے آداب کیا۔

"جیتے رہو۔" وہ جلدی جلدی کرسیاں آگے کرنے لگی۔

"ارے بھئی عائشہ! اس پنکھے کی سپیڈ تو بڑھاؤ' ذرا ہوا محسوس ہی نہیں ہو رہی۔"

"پرانا ہو گیا ہے بہت اس لئے اس کی ہوا بس اتنی ہی ہے' وہ شرمندگی سے گویا ہوئیں۔"

"ارے.... تو تم نے کہا کیوں نہیں عباد سے کل لے آئے گا نوکر پنکھا' خود ہی لگا بھی جائے گا۔ دوسرے کمرے میں پنکھا ہے؟۔" انہوں نے رومال سے اپنا چہرہ پونچھا۔

"ارے نہیں بھابی.....! ہمیں تو یہ پنکھا بھی بہت ہے آپ پنکھا مت بھجوایئے گا۔"

"تمہاری تو عادت ہے عائشہ ہر چیز کو نہ کرتی ہو' ارے دیال تمہارا اپنا بھائی ہے کوئی غیر تو نہیں۔"

"(جی.... اسی دیال بھائی کے ہوتے ہوئے بھی میرا چولہا ٹھنڈا رہتا ہے) وہ خاموش ہو رہیں۔ وہ

چائے بنانے اٹھیں تو عذرا بولیں۔"

"بھائی چائے وائے نہ بنانا ہم ذرا یہیں قریب ہی ایک سالگرہ پارٹی میں آئے تھے راستے میں تمہارا گھر پڑتا ہے سوچا خیر خیریت معلوم کرتی چلوں۔"

"بیٹی کہاں ہے تمہاری؟۔"

"اسماء..... بیٹے ادھر آؤ..... ممانی جان بلا رہی ہیں۔"

وہ اسے ان کے پاس بھیج کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

اسماء سہم کر دروازے میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔

گھسے ہوئے سرخ فراک اور پائنجامے میں وہ شیشے کی گڑیا لگ رہی تھی حسن پرست ممانی نے گھائل ہو کر اسے چمکار کر اپنے پاس بلایا۔

"ادھر آؤ بیٹے!۔"

"وہ آہستہ روی سے ان کے پاس پہنچ گئی۔"

"امی! کتنی گندی ہے یہ لڑکی۔" حماد نے ناک سکوڑ کر گرد میں آئے ہوئے اسماء کے پاؤں دیکھے اسماء کا کلیجہ کانپ گیا۔

"بری بات' تین سال بڑے سجاد نے فہمائشی نظروں سے حماد کو دیکھا۔"

"ارے لڑکی! کیا تمہارے پاس جوتے نہیں ہیں؟۔"

"ہیں مگر وہ تو اسکول پہن کر جاتی ہوں۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اسے تو ننھا حماد شہزادوں جیسا لگ رہا تھا۔ لباس سے بھی' بول چال سے بھی'۔"

"تو کیا گھر میں ننگے پاؤں رہتی ہو۔"

"حماد!۔" ماں نے نند کو آتے دیکھ کر گھورا

"میں نے تم سے کہا تھا ناں' مگر تم نے پھر بھی اپنی ہی کی' یہ بچے تو ناشتے میں بھی چائے نہیں پیتے۔"

"نہیں امی! پھوپھا بنا کر لائی ہیں تو میں پی لوں گا۔"

سجاد نے آگے بڑھ کر کپ اٹھالیا۔

حماد اسی طرح تنا تنا بیٹھا رہا۔

"بھئی پرسوں عید ہے' اسماء کے کپڑے وغیرہ بنائے ہیں یا نہیں؟۔"

"ہیں اس کے پاس کپڑے' آپ فکر نہ کریں۔"

"ارے حد کرتی ہو' ہم کیوں فکر نہ کریں' بچی نہیں ہے ہماری۔"

انہوں نے پرس کھول کر سو سو کے تین نوٹ نکالے اور اسماء کو دینا چاہیے

"بھابی! یہ آپ کیا کر رہی ہیں' میں کہہ رہی ہوں ناں ہیں اس کے پاس کپڑے۔"

اب اتنی اچھی چیز بھی نہیں تمہاری خودداری' میں خدانخواستہ بھیک تو نہیں دے رہی ہوں جو تم اس طرح میرے ہاتھ روک رہی ہو' ہٹو پیچھے۔ لو اسماء اپنی امی کے ساتھ جا کر اچھے سے کپڑے لے کر آنا اور پھر عید پر گھر آنا"

اسماء نے پیسے نہیں لئے' خوفزدہ سے انداز میں ماں کو دیکھا۔

وہ نظریں جھکا کر پیچھے ہٹ گئیں۔ عذرا نے پیسے اسماء کی مٹھی میں دبا دیئے اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئیں۔

عائشہ نے میکے میں یتیمی کا وقت گزارا تھا۔ بھائیوں کو آگے بڑھنے' دولت مند بننے کا جنون تھا' دونوں نے جلد ہی اپنا بوجھ اتار پھینکا تھا' یوں بھی دونوں بال بچوں کی ذمہ داری میں الجھ چکے تھے شوہر کے ہوتے ہوئے بھائی مہینوں نہیں جھانکتے تھے۔ تو تین سال شادی شدہ رہ کر جلد ہی وہ بیوہ ہوگئیں تو کس برتے پر بھائیوں کی چوکھٹ پر جا پڑتیں۔ جب کہ بھائیوں نے بہت کہا مگر انہوں نے یہ افلاس بھری خودمختاری نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حساس اتنی ہوگئیں تھیں پہلے سے مقابل کے ذہن تک جا پہنچتیں۔ اس تنہائی سے ان کا سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ نزدیک سلائی کڑھائی کے مرکز میں نگرانی کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ اسی گزر پر بنا ہوا دو کمروں کا مکان ان کے شوہر کی ساد تنگ ودو کا صلہ تھا اس پر بھی وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتی تھیں کہ سر چھپانے کا آسرا تھا۔

وہ کبھی کبھار بھائیوں کے ہاں جاتی تو اسماء کو کبھی ساتھ لے کر نہ جاتیں۔ مبادا وہ اپنے ماموؤں

اور ان کے ٹھاٹھ با... سے مرعوب نہ ہو جائے۔ اور احساس کمتری کا شکار نہ ہو جائے وہ بہت توجہ سے اسے تعلیم دلا رہی تھیں۔ اسے اعلیٰ اخلاقی تربیت دے رہی تھیں۔ ہر وقت کی تنہائی نے اسے بے حد کم گو بنا دیا تھا۔ بے حد خوش طبیعت پائی تھی اس نے۔

ان دنوں جب گزرتے ماہ و سال اسے درجہ دہم کی طالبہ بنا چکے تھے اور وہ ماں کی بیساکھی بن رہی تھی ایک دن اچانک دروازہ بجا ماں موجود نہیں تھیں۔ لہٰذا اس نے آنے والے کا نام پس در پوچھا۔

نام بتانے کے بجائے آنے والے نے تنتنا کر ارشاد کیا۔

"ارے بھائی دروازہ کھولیئے۔" پھر بڑبڑاہٹ سنائی دی "اچھی مصیبت ہے"

اس نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایسا اجلا بانکا سجیلا نوجوان تھا کہ وہ حیران ہو کر ایک دم پیچھے کو ہو گئی۔

"پھوپھو کہاں ہیں؟۔"

"وہ تو نہیں ہیں۔" اب وہ از خود سمجھ گئی کہ وہ اس کا کوئی ماموں زاد ہے

ان سے کہہ دیجئے گا کہ امی سیونتھ ڈے میں ایڈمٹ ہیں۔ اور یاد فرما رہی ہیں" وہ ملاقات کا ٹائم بتا کر الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ ایسا جلال 'اتنا کروفر دیکھ کر اس کی تو ہمت ہی نہ ہوئی کہ کہہ دے اندر تشریف لائیں۔

تھوڑی دیر بعد عائشہ آ گئیں تو اس نے بتایا۔

"امی ایک صاحب آئے تھے آپ کو پھوپھو کہہ رہے تھے اور کہہ رہے تھے امی سیونتھ ڈے میں ایڈمٹ ہیں۔ اتنے بجے آ کر ملاقات کر لیں۔ حالت بہت سیریس ہے۔"

"اے ہے نام کیا بتایا تھا؟۔"

"نام نہیں بتایا تھا' میں نے تو پوچھا بھی تھا۔"

"پتا نہیں بڑی بھابی کے ہاں سے آیا تھا کہ چھوٹی بھابی کے ہاں سے 'کیا عمر ہو گی اس کی جو آیا تھا یہ کہنے؟۔"

"بس لڑکے سے تھے 'مجھ سے بڑے ہوں گے۔"

"اچھا.... پھر تو چھوٹی بھابی کے ہاں سے آیا ہو گا۔ ارے خدا خیر کرے ابھی بے چاری نے دیکھا ہی کیا ہے 'خدا رحم کرے۔"

وہ اسی وقت اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"رات نو دس بجے تک آؤں گی' ساتھ والوں کو کہہ کر جا رہی ہوں دروازہ اچھی طرح سے بند کر لینا۔" وہ تو بوکھلاہٹ میں تیزی سے باہر نکل گئیں۔

"توبہ امی! شکوہ کناں بھی رہتی ہیں اور محبت کا یہ عالم ہے کہ کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہا۔" وہ دھلے ہوئے کپڑے رسی سے اتارنے لگی۔

رات کے لئے اس نے روٹی بھی ڈال لی مگر عائشہ نہ آئیں اب تو وہ ایک دم ہراساں نظر آنے لگی۔

"یا اللہ! کیسے معلوم کروں امی کیوں نہیں آئیں اب تک کہاں رہ گئیں خدایا '! پتا نہیں انہیں بس ملنے میں وقت نہ ہوئی ہو' ہونہہ 'اتنی لمبی لمبی گاڑیاں ہیں کیا انہیں کوئی پہنچا بھی نہیں سکتا۔" وہ کبھی اٹھ کر صحن میں پھرنے لگتی۔ کبھی کھڑکی سے باہر جھانکتی 'بی پڑوسن نے بھی کئی بار دیوار سے سر ابھار کر پوچھ ڈالا

"اے اسماء! آ گئیں تمہاری امی؟۔"

"نہیں خالہ جان!۔" وہ رونے کو ہو گئیں "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے انہیں کوئی سواری نہیں ملتی"

"ارے اللہ رکھے ان کے بھائیوں کی تو موٹریں ہیں چھوڑ جاتا کوئی بے چاری غریب عورت ' ایک تو وہاں جان کھپا کر آئی' اس پر بلا لے گئے۔ لو بھلا' ماں جایا بھی آج تو پرایا ہو گیا' اور کھانا کھا لیا تم نے؟۔" انہیں خون کی سفیدی کے تجزیئے سے لمحاتی فراغت نصیب ہوئی تو کھانے کا پوچھا۔

"امی تو آ جائیں' کھانا کیسے کھالوں'۔" اس کے آنسو بہہ نکلنے کو بے تاب تھے۔

"آ رہی ہوں گی' جی ہلکان نہ کرو' اے لو وہ واجد کے ابا برابر بانگ دے رہے ہیں کھانا دے

دوں انہیں۔" وہ اتر گئیں

اسماء دوبارہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی

اسی دم سامنے سے گاڑی کی ہیڈلائٹس روشن ہوئیں' اور گاڑی رک گئی۔ گاڑی دروازے کے سامنے رکی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ عائشہ آ گئیں ہیں۔ وہ لپک کر دروازے پہ آئی دروازہ کھولا تو وہی سامنے شام والا نوجوان کھڑا تھا اس نے بے تابی سے کار کی سمت دیکھا اس کے چاروں دروازے بند تھے۔

"مم.... میری امی کہاں ہیں؟۔" اس نے تڑپ کر پوچھا۔

"میں آپ کو لینے آیا ہوں۔" نہایت آہستہ جواب میں ایک دم الٹ جواب ملا

"امی.....۔" اس نے اپنے سوال کا جواب جاننا چاہا

"میری امی کی ڈیتھ ہو گئی ہے پھوپھو گھر پر ہی ہیں' مجھے پاپا نے کہا ہے کہ آپ کو لے آؤں آپ پریشان ہوں گی' حالانکہ ایک اچھی خاصی سمجھدار لڑکی کیا ایک رات تنہا نہیں رہ سکتی؟۔" مگر پاپا اور پھوپھو..... جلدی کیجئے..... میرے پاس.... وقت نہیں ہے...."

اس کا لہجہ بھرایا ہوا تھا جیسے رو تا ہو

اور وہ تو یہ سن کر دم بخود رہ گئی تھی کہ ممانی جان کا انتقال ہو گیا ہے وہ کمزور اعصاب کی لڑکی گھر بند کر کے پانچ منٹ کے اندر اندر گاڑی میں بیٹھ گئی' پڑوسن تک کو بتانے کی ضرورت نہ سمجھی' انہی کپڑوں میں آج وہ دوسری مرتبہ اپنے دولت مند ماموں کے گھر جا رہی تھی پہلی مرتبہ سنا تھا کہ ماں کی گود میں گئی تھی۔

"ماں نے اپنے دولت مند بے نیاز بھائیوں کے گھر سے بیٹی کو اس لئے دور رکھا تھا کہ اس میں احساس کمتری پیدا نہ ہو وہ پڑھ لکھ کر کم از کم لیکچرار بن جائے مگر اس کے باوجود کہ اتنی احتیاط کی گئی تھی اس میں نام کو اعتماد نہیں تھا گھبرائی گھبرائی' بوکھلائی بوکھلائی' آخر ماں سے کوتاہی تو ہو ہی گئی تھی آس پاس کے متوسط رشتہ داروں کے اتنے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر جب ماں کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا کہ اس کے ماموں ان سے دس گناہ زیادہ مالدار ہیں تو وہ ان کی آرائش و آسائش کا تصور با آسانی کر سکتی تھی۔"

اتنا اعتماد بھی نہیں تھا کہ اس سے تعزیتی کلمہ کہہ دیتی کہ مجھے دکھ ہوا ہے یا ممانی جان کو کیا ہو گیا تھا۔ سر جھکائے ہاتھ مسلتی رہی۔ یہاں تک کہ گاڑی ایک دھچکے سے رک گئی۔

اس کے سامنے ایک عظیم الشان عمارت تھی جس میں داخل ہوتے وقت اس کی ٹانگیں کانپ کانپ گئیں اندر بے پناہ رش تھا۔ دو لڑکیاں پچھاڑیں کھا کھا کر رو رہی تھیں' معلوم ہوا کہ ان کی بیاہتا صاحبزادیاں ہیں جن کی نخوت اور غرور کے قصے اس نے بے پناہ سنے تھے۔ گھر کا ہر فرد غم سے نڈھال تھا۔ سفید سفید چاندنیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ تک آبدیدہ ہو رہے تھے ماموں جان کے علاوہ ایک وہ اسے مضبوط اعصاب کا نظر آیا۔ جو چہرہ بے تاثر کئے ادھر ادھر آ جا رہا تھا' تمام راستے جو ہونٹ بھینچے گاڑی چلاتا جا رہا تھا تب اس نے حیرانی سے سوچا تھا کہ کیا اسے اپنی ماں کا دکھ نہیں خدا نخواستہ اگر اس کی امی کو کچھ ہو جائے وہ تو دوسرا سانس بھی نہ لے پھر۔

کوئی اس کی جانب متوجہ نہیں ہوا تھا' ویسے بھی افراتفری مچی ہوئی تھی' اس نے امی کو دیکھا جو میت کے سرہانے بیٹھے قرآن پڑھ رہی تھیں۔ وہ بھی وضو کر کے وہاں ماں کے پاس ہی سپارہ لے کر بیٹھ گئی' امی نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی بس چشمے سے ایک نظر اسے دیکھا تھا پھر دوبارہ پڑھنے میں مصروف ہو گئیں۔

"آنٹی! انکل کہہ رہے ہیں جنازہ صبح ہی اٹھے گا' سجاد نے جوابی ٹیلکس بھجوایا ہے وہ صبح پہنچ رہے ہیں۔" اسماء نے آواز کی سمت نظر اٹھائی

کوئی خاتون ایک بڑی بی سے مخاطب تھیں' تب اسے بھی معلوم ہو گیا کہ سجاد بھائی باہر ہیں۔

تمام رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ نزدیک سے آئے ہوئے لوگ واپس چلے گئے تھے کہ صبح جنازے پر آئیں گے۔

ممانی جان کے میکے والوں کی تعداد کثیر تھی ماموں جان کے رشتہ داروں میں تو ایک بڑے ماموں کا گھر تھا یا دونوں ماں بیٹی تھیں۔

کتنی ہی افراتفری سہی مگر کوئی جھوٹ سے بھی اس کی سمت متوجہ نہیں ہوا تھا' اس کا دل اپنی

بے پناہ حساسیت کی وجہ سے نہایت اجنبیت محسوس کر رہا تھا' وہ سمجھ گئی کہ آخر اس کی ماں اسے یہاں لانا کیوں پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے بھی سوچ لیا تھا وہ آئندہ ان برف کی سلوں کی مانند ڈھلے ہوئے فرعونوں کے ہاں نہیں آئے گی' موت کا گھر سہی کیا یہ خواتین آپس میں اتنی دیر سے غیر متعلقہ باتیں نہیں کر رہی تھیں؟ کس کی بیوگی' کسی کی طلاق' کسی کی شادی اور منگنی پر تبصرے نہیں کر رہی تھیں.....؟"

جنازہ اٹھتے اٹھتے دوپہر کے بارہ بج گئے تھے۔ سجاد اپنی غیر ملکی بیوی اور بیٹے کے ہمراہ آٹھ بجے صبح کراچی پہنچ گئے تھے۔

جنازہ اٹھتے ہی اس نے ماں سے گھر چلنے کو کہا۔

"صبر کرو.... چلتے ہیں' کیا سوچیں گے سب لوگ؟ موت کا گھر ہے......؟۔" انہوں نے دبی دبی زبان میں گویا اسے جھاڑا۔

اف اتنی بے نیازی..... اتنی اجنبیت کے باوجود امی کا جی نہیں چاہ رہا گھر جانے کو؟ وہ تو ایک دم گھٹ کر رہ گئی تھی۔

دوپہر کو کسی نے کھانا بھجوایا تھا مگر اس نے ایک نوالہ تک زہر مار نہ کیا تھا۔

امی سے معلوم ہوا تھا کہ ممانی جان کو "لیکومیا" ہو گیا تھا تشخیص میں دیر ہو جانے کی وجہ سے ان کی جان نہ بچائی جا سکی۔ گھر والوں کو گزشتہ دو ماں سے معلوم تھا انہیں باہر بھیجنے کے انتظام کرتے کرتے یہ دن آن پہنچا تھا کہ وہ دنیا سے باہر ہو گئیں۔

اتنی ہنستی بولتی ممانی کے بارے میں اسے یہ جان کر بہت دکھ ہوا

جب امی دوبارہ قرآن خوانی میں مصروف ہو گئیں تو وہ باہر لان کی سیڑھیوں کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی' اسے غصہ کرنا نہیں آتا تھا بس رونا آتا تھا۔

وہ سامنے کھڑا غالباً" کسی کو خدا حافظ کہہ رہا تھا وہ جانے کیا سوچ کر آگے لپک کر چلی آئی۔

"حماد بھائی! آپ مجھے گھر چھوڑ آئیں۔" اس نے سادگی سے جانے کیسے کہہ دیا۔

حماد نے اس پندرہ سالہ دوشیزہ کو یوں تعجب سے دیکھا جیسے خدا معلوم کیا انہونی ہو گئی ہو۔

• "تکلیف کیا ہے آپ کو.....؟ کیا یہ گھر نہیں ہے.....؟۔"

"میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"آپ کے خیال میں' میں اس قدر فارغ ہوں کہ آپ کو لاتا' پہنچاتا رہوں' رات پاپا نے کہہ دیا تو چلا گیا ورنہ آپ کے بنا یہاں کون سے کام رکے پڑے تھے۔" اس کے لہجے میں سنگینی اور نخوت تھی۔ وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا گویا خود ہاتھ ہو اور وہ چیونٹی ہو۔

اس نے غلط اندازہ کیا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی' اس کی زبان کا کوڑا اس کے کانپتے دل پر پڑا تھا..... دوسروں کے سامنے تو خود کو خوددار اور مصفیٰ بنا کر پیش کرنا پھر بھی آسان ہوتا ہے اپنی نظر میں تمام تر حقائق کی موجودگی میں معتبر کرنا کتنا کٹھن عمل ہے وہ اپنی نظر میں کم تر ہو گئی تھی اسے وہاں کے در و دیوار کاٹنے کو دوڑ پڑے۔ وہ وہیں زینے پر بیٹھ گئی۔

بعض اوقات کم مایا آدمی "مایا" کا نہیں ایک دوست' ایک شناسا کا بھکاری بن جاتا ہے۔ غریب آدمی کو امیر کی مہربانی کا رویہ بھی نہیں بھولتا۔

کتنا بڑا آدمی ہے مگر کسی طرح سینے سے لگایا تھا۔ غرور تو نام کو نہیں۔

غریب آدمی کو امیر آدمی کے ہاتھوں اپنی تحقیر بھی نہیں بھولتی۔

آنکھیں تذلیل پر روئیں نہ روئیں خوددار دل لہو روتا ہے

اسے تو یہاں ایک بھی دوست ایک بھی شناسا نظر نہیں دکھائی دی تھی۔ اس کی ذہنی اذیت مرحومہ کے متعلقین سے بھی سوا تھی۔ کہ وہ تو اس حادثے کے لئے دو ماہ پیشتر سے تیار ہوں گی اس پر تو ناگہانی ٹوٹ پڑی تھی۔

گیٹ سے برآمدے تک کتنے لوگ آ جا رہے تھے مگر کسی نے اس کی سمت نہیں دیکھا تھا' اب اس کے ماتھے پر تو نہیں لکھا تھا وہ غریب اور یتیم ہے مگر چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق اسے یہی احساس کھائے جا رہا تھا کہ غربت کی وجہ کسی نے اسے گھاس نہیں ڈالی۔

بعض اوقات بے پناہ حساسیت بھی انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔

اسی دم امی اسے ڈھونڈتی ہوئی باہر آ گئیں۔ اور اسے سمجھانے لگیں۔

"بیٹے! سوئم تک میں کیسے چلی جاؤں سب کیا کہیں گے سب کو معلوم ہے کہ عذرا بھابی کی اکلوتی نند ہوں لوگ کہیں گے کہ ایک دن بھی گھر نہیں سنبھال سکی۔ جان چھڑا کر چلی گئی پھر بھائی میاں نے بہت کہا ہے کہ میں یہیں ٹھہروں۔"

اس کا جی چاہا کہ ماں سے پوچھے کہ اس سے پہلے کتنی بار آپ کو روکا ہے؟ مفت کی منتظمہ ہاتھ آگئی ہے ناں۔

مگر ماں کے سامنے وہ پھر عادتاً" چپ ہو کر رہ گئی تھی۔

"اور تم یہاں سیڑھیوں پر کیوں بیٹھی ہو'؟ چلو اندر آؤ۔"

"کیا کروں گی اندر جا کر؟" اس کے لہجے میں ہلکی سی خود سری چھلک آئی۔

خواہ مخواہ کی مار پر تو گدھا بھی بدک جاتا ہے اور وہ تو پھر انسان تھی۔ خودداری پر چار چوٹ کھا کر اب اسے مزید کی تمنا نہیں تھی' وہ دوبارہ سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

سامنے کھڑے سجاد بھائی نے غالبا" پھوپھو کو اس سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔ اور اسے پہچان لیا تھا۔ بڑی بی تو ایک دم سے ہو گئی تھی۔ چار فٹ سے ایک دم ساڑھے پانچ فٹ پر آکر ٹھہری تھی۔ دوبارہ زینے پر بیٹھ کر اپنی چوٹی آگے کر کے کھول کر دوبارہ بل ڈالنے میں مگن ہو گئی تھی۔

"بھئی' تم اسماء ہی ہو نا؟۔"

اس دودھ کی جلی نے کوفت بھری نظریں اٹھا کر اپنے مقابل دیکھا۔ مگر سجاد کی مشفق مسکراہٹ سامنے دیکھ کر آہستگی سے بولی "جی.....؟"

"تو بھئی' یہاں کیوں بیٹھی ہو؟۔"

"ایسے ہی.....۔" اس نے نظریں جھکا کر اپنے مخصوص دھیمے انداز میں جواب دیا۔

"ارے بھئی اندر چل کر بیٹھو۔" تب وہ ناچار اندر آگئی۔

"اچھی مصیبت ہے' اس گھر میں کوئی اپنی مرضی سے بیٹھ بھی نہیں سکتا۔"

جرات کلام تو تھی نہیں جی ہی جی میں جل کر رہ گئی۔

اسے تو یہاں اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا نوکروں کی طرح اس نے آگے بڑھ

بڑھ کر کام کیا تھا ہر چند اس نے سوچا تھا وہ محض ایک کونے میں بیٹھ رہے گی۔ مگر سامنے جیسے ہی کوئی کام ہوتا وہ خود بخود آگے بڑھ آتی تھی۔ اس کی اس بھاگ دوڑ سے گھر میں کوئی متاثر نظر نہیں آرہا تھا۔ یوں جیسے یہ اسی کا کام اور مقام تھا۔

اپنی فیشن ایبل ماموں زاد بہنوں کو اس نے قرآن خوانی سے بھی غائب پایا تھا۔ سوائے ماموں جبار کی سب سے چھوٹی لڑکی ربیعہ کے جو اس سے بڑی اپنائیت سے پیش آئی تھی۔

سر شام اکتاہٹ کی انتہا ہو گئی' وہ ماں کے سامنے رو پڑی کہ وہ گھر جانا چاہتی ہے۔

جب عائشہ نے بھائی سے کہا کہ وہ اسماء کو لے کر گھر جا رہی ہیں۔ تو انہوں نے شائد زندگی میں پہلی مرتبہ بہن کی اہمیت محسوس کی تھی۔ شتر بے مہار بے سمت بیٹیاں جنہوں نے اپنے بر خود ڈھونڈ کر انہیں بہت جلد الوداع کہہ دیا تھا من مانی کرنے والی بیوی بہرحال حقیقی دمساز بھی تھیں۔ بہن نے جانے کو کہا تو وہ بولے۔

"عائشہ! تم بھی چلی جاؤ گی تو یہ سب کون سنبھالے گا؟۔"

بہن اس حقیقت سے ناواقف تھیں کہ مرحومہ نے شوہر کے ساتھ غلط بیانی سے کام لیا تھا کہ عائشہ بے حد خوددار ہیں وہ مر کر ہی شوہر کی چوکھٹ چھوڑیں گی۔ البتہ وہ بچی کو اخراجات کے لئے مناسب رقم دے دیتی ہیں۔

اپنی بیویوں پر اندھا اعتماد کرنے والوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ بہن کو بھائی اپنے بازوؤں میں تھام کر اپنے گھر خود لے کر آتا' اسے اپنے گھر میں معتبر مقام دیتا تو بہن سر آنکھوں پر بھائی کے گھر میں اپنائیت کے احساس سے چور ہو کر آتی' محض اس طرح کہنا کہ جیسے فرض ادا کر دیا جائے تو بات نہیں بنتی۔ بھاوج کے رسمی انداز سے وہ مستقبل میں ان کے گھر میں اپنے مقام کا اندازہ کر سکتی تھیں آگے چل کر انہیں اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ ان کا فیصلہ دانشمندانہ تھا۔ وہ مرحومہ کے خلاف بھائی سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ وہ کون سے چیک ہیں جو میرے گھر بھیجے گئے ہیں"۔

اور اپنی بھاوج کو بھی دم مرگ اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا تھا۔ تب ہی انہوں نے حماد سے کہہ کر انہیں بلوایا تھا ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس طرح معافی مانگی تھی کہ کئی لڑیاں آنسو کی آنکھوں

سے ٹوٹ کر تکیے میں جذب ہو گئیں تھیں۔

اس نیک فطرت عورت کے اذیت ناک سال بھابی کے آنسوؤں میں گم ہو گئے تھے۔ وہ تہہ دل سے اپنی بھاوج کو معاف کر چکی تھیں۔ اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر۔

موت کے گھر میں انہیں فرصت ہی نہ مل سکی تھی کہ وہ اسماء سے یہ سب باتیں کرتیں بھائی نے پھر مجبور کر دیا کہ عائشہ یہ خودداری کا کون سا مقام ہے کہ اس گھر کو اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔ وہ ہتھیار ڈال کر باہر آئیں تو وہ گھر چلنے کو بے تاب کھڑی تھی۔

مگر ماں کی چال کا انداز اور ہی تھا۔

"چلیں امی....؟۔"

"اسماء بیٹے....!۔"

جن لوگوں سے وہ ساری عمر شاکی رہی تھی۔ ان کی حمایت میں بیٹی' کچی کلی جیسی بیٹی کے سامنے بولنا بہت کٹھن مرحلہ تھا

"بھائی میاں' بہت روک رہے ہیں' وقت بھی ایسا ہے کہ میرا انکار بہت معیوب ہو گا۔"

"مجھے نہیں پتا امی! اگر ایک دو گھنٹے اور رک گئیں میرا تو دم گھٹ جائے گا۔"

"بری بات بیٹے! وقت کی نزاکت کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔"

"امی....!۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"اسماء.... کیا کسی نے کچھ کہہ دیا ہے؟۔"

"نہیں امی! میرا دم گھٹ رہا ہے ان مغرور لوگوں کے بیچ۔" آخر اس نے حقیقت کہہ دی۔

"ایسے نہیں کہتے' ان بے چارے بچوں کے سر پر سے تو ماں کا سایہ اٹھ گیا ہے۔"

"امی....!۔" اس کی آواز بھرا گئی' میں نہیں رہوں گی یہاں" آنسو سلسلہ وار رخساروں پر ڈھلک آئے۔

انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا' وہ سخت مجبور تھیں۔ شادی کا گھر ہوتا تو شائد وہ کبھی نہ رکتیں۔ اسماء بچی تھی' اسے ان کی مجبوری کا احساس نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی' وہ مزید کچھ بولیں گی تو وہ زیادہ رو پڑے گی۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ یہ وہ بیٹی ہے جس نے کبھی ضد نہیں کی تھی۔ وہ اسے وہیں چھوڑ کر اندر چلی گئیں۔

وہ ستون کی سمت منہ کر کے بچوں کی طرح آنسو بہانے لگی۔ اسے امی سے یہ امید نہیں تھی۔ وہ بہت چاہ رہی تھی کہ آنسو رک جائیں ساتھ ساتھ دوپٹے سے منہ پونچھے جاری تھی مگر آنکھیں تو گویا دریا بنی ہوئی تھیں جس پر سیلاب کا زور ہو۔ معاً" اسے پیچھے سے قدموں کی آواز سنائی دی اس نے جلدی جلدی دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں' آنے والا سامنے آگیا وہ تو گویا جیسے چوری کرتی پکڑی گئی تھی نہ چاہتے ہوئے بھی سامنے دیکھا۔

سامنے حماد تھا جو الجھی الجھی نظروں سے اس کے آنسوؤں سے دھلے چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح بھاگے۔ اس نے لان کی سمت قدم بڑھا دیئے۔

"ارے بھائی' یہ رات کے وقت آپ ادھر کہاں جا رہی ہیں؟۔"

میں ان کی کوئی بات مانوں گی نہ سنوں گی" وہ آگے بڑھتی چلی گئی' وہ پیچھے کھڑا اسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس کے وجود پر شک ہو۔

خدا معلوم اس نے وہاں ایک ہفتہ کس طرح گزارا تھا گھر واپس آئی' ایسا محسوس ہوا گویا دوبارہ زندگی ملی ہو' بڑے صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا تھا گھر آ کر ماں بیٹی نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا تھا۔ بڑے خاموش سے سمجھوتے ہو گئے تھے اور ویسے بھی عائشہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان کی اتنی معصوم اور فرمانبردار بیٹی ان پر بگڑنے کی جرات کرے گی۔ وہ صرف رو سکتی تھی۔ اس کی خاموشی ان کا دل شمع کی طرح پگھلاتی تھی۔ رات کو جب وہ پیٹھ موڑے لیٹی نیند کا انتظار کر رہی تھی۔ عائشہ س کے پلنگ کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

"اسمی.....!۔"

"جی امی؟۔" وہ اسی طرح چہرہ اندھیرے میں کئے بولی۔

"کیا سوچ رہی ہو میری جان؟۔"

"کچھ بھی نہیں امی! بس نیند آ رہی ہے۔"

"وہ سیدھی ہو کر ماں کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے اس کے بال سنوارے جھک کر ماتھا چوما۔"

"تم شکایت کرتی تھیں ناں کہ میں تمہیں ماموں سے نہیں ملاتی۔ تو اب وجہ سمجھ میں آ گئی ہو گی۔ بھائی میرے بہت اچھے ہیں مگر..... اور اب تم مصر تھیں کہ میں ایک دن بھی وہاں نہ ٹھہروں ابھی تمہاری سمجھ محدود ہے' عمر کے ساتھ ساتھ مقام اور توقعات بھی اپنی شکل بدلتے ہیں میری عمر میں آ کر بلکہ اب کہ چند سالوں میں خیر سے گھر بار والی ہو جاؤ گی تو میری ساری مجبوریاں خود بخود سمجھ میں آ جائیں گی۔" اپنی ماں کے بارے میں کوئی غلط خیال نہ دل میں لانا"

"امی!۔" اس نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا" کیسی باتیں کرتی ہیں آپ .... میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں سوچ رہی' میں تو یہ سوچ رہی ہوں' میرا رزلٹ آ جائے گا تو میں کون سے کالج میں ایڈمشن لوں..... "اس نے گویا موضوع بدل دیا" کون سے کالج میں لوں امی؟"

"بھئی رزلٹ تو آ جانے دو' پرسنٹیج کے لحاظ سے کالج کا انتخاب کرنا ابھی سے اتنی فکر نہ کرو ویسے ہی مجھے تمہاری صحت کی طرف فکر رہتی ہے۔' لیجئے اتنی ہٹی کٹی تو ہوں" اس نے مسکرا کر لاپرواہی سے کہا تو عائشہ نے ایکدم ٹوکا۔

ارے ایسے ایک دم منہ بھر نہ کہا کرو" انہوں نے کہا اس کے گداز جسم سے نظریں چرائیں جس میں نئے وقت کے پھول کھل رہے تھے۔

"ارے اتنی سی روح اسی جگہ لاتے لاتے میری جان سولی پر لٹکی رہی' خدا سلامت رکھے دشمنوں کی نظر سے بچائے خود ہی اپنی جان کو ٹوک نہ لگایا کرو' میرا تو دل دہل جاتا ہے۔"

وہ ماں کے وسوسوں پر کھلکھلا کر ہنس دی۔ تو ان کے آنگن میں روشنیاں برس پڑیں۔

ممانی جان کے چہلم تک عائشہ کا آنا جانا ذرا تواتر سے رہا۔ وہ پلٹ کر دوبارہ نہ گئی' چہلم پر انہوں نے اس پر کافی زور بھی دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی

دن بڑی سرعت سے گزرنے لگے۔ اس نے مقامی کالج میں ایڈمیشن لے لیا تھا کالج کسی وجہ سے

بند تھے۔ وہ اپنی قمیض پر کڑھائی میں مگن ہو گئی' ہمسائی کے پاس جا کر بیٹھ جاتی اور خوبصورت کڑھائی کرتی۔ ان کی لڑکیوں کی وجہ سے اس کا جی بہل جاتا تھا۔

اس دن بھی وہ نہایت جوش و خروش سے کڑھائی میں مصروف تھی۔ سندھی گلا تقریباً" مکمل تھا' جب ہمسائی کی بیٹی نے اس کے بھرپور سراپے اور حسین مکھڑے کو دیکھ کر کہا۔

"اسماء باجی! لگتا ہے آپ کو تو آپ کے دولت مند ماموں کے صاحبزادے ہی لے جائیں گے۔"

"ہائیں.... وہ کیوں.....؟" وہ اپنی دھن میں مگن بولی۔

"میرا مطلب ہے' باجے گاجے کے ہمراہ۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"ارے نہیں بھئی' بڑے غلط اندازے ہیں تمہارے جب بھائیوں نے میری امی کو اہمیت نہیں دی تو ان کی اولادیں'۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر سوئی دانتوں تلے دبالی اور فریم کسنے لگی۔

"کبھی آپ نے خود کو غور سے دیکھا ہے؟" اس کی نگاہوں میں بے پناہ رشک تھا۔

"دیکھا ہے' انسانوں جیسی ہوں۔" اس نے سوئی میں پڑے دھاگے کی نظروں سے پیمائش کی اور تیزی سے ٹانکہ لیا۔

"انسانوں جیسی ہی تو نہیں ہیں پریوں جیسی ہیں۔"

اسماء کھلکھلا دی۔

"مجھے پتا ہے تم مجھے بہت چاہتی ہو' اس سے زیادہ بھی مبالغہ آرائی کرو تو حیرت کی بات نہیں۔" وہ بدستور ٹانکوں میں الجھ کر بولی۔

"دراصل تم نے انہیں دور سے دیکھا ہے' اور سنا ہے میرے کزنز اتنے مغرور ہیں کہ انہوں نے تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کی مجھ سے۔ بہت گھمنڈ ہے ان لوگوں کو اپنی دولت پر۔" اس نے افسردگی سے بتایا۔

"تو اسماء باجی! آپ بھی تو برابر کی چوٹ ہیں' خدا نے آپ کو سیرت اور صورت کی دولت سے نوازا ہے۔"

"ارے بھائی.... آج کے دور میں یہ خوبی تو ہو سکتی ہے دولت نہیں۔"

ہمسائی نے لڑکیوں کی بات سن کر درمیان میں ٹکڑا لگایا اور ہمسائی کو درمیان میں بولتے دیکھ کر دونوں نے موضوع ہی بدل دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ گھر آگئی تھی۔ عائشہ بھی آنے والی تھیں۔ وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی 'اب تو چھوٹے ماموں اکثر ان کا احوال معلوم کرنے ان کے گھر آجاتے تھے۔ ان کے اس اقدام نے بڑے بھائی کو بھی شاید خواب غفلت سے جگادیا۔ وہ بھی پہلے کی نسبت جلدی جلدی آجاتی تھے اکثر ربیعہ ان کی چھوٹی بیٹی ہمراہ ہوتی۔

باقی بچوں سے تو وہ ممانی کی موت پر مل چکی تھی۔ بڑے ماموں کے ایک صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں شادی شدہ تھیں۔ ربیعہ اور اس سے بڑے صاحبزادے ہارون ابھی "فارغ" ہی تھے۔ بچوں میں سے تو ربیعہ اور ہارون ہی ان کے گھر آئے تھے۔ ہارون بھی برسوں پہلے کسی بہن کی شادی کا کارڈ لے کر یا شاید مہندی ابٹن کا بلاوا لے کر آئے تھے۔ ربیعہ آپا کے پاس پلی بڑھی تھی۔ اس لئے ممانی جان اسے ساتھ نہیں رکھتی تھیں۔ مگر اب اس کی ربیعہ سے دوستی ہوگئی تھی۔

اسی دن شام کو جب وہ حسب معمول ماں کا انتظار کر رہی تھی۔ دروازے پر نامانوس سی دستک ہوئی

دروازہ کھولنے سے پیشتر اس نے آنے والے کا نام پوچھا۔

"میں گارمنٹس فیکٹری کا ورکر ہوں۔"

یہ سنتے ہی اس نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔

ماں کے بجائے شفیق گارمنٹس فیکٹری کے ورکر کو سامنے دیکھ کر وہ حیران تھی۔

"فیکٹری گودام میں آگ لگ گئی 'کئی ورکر اندر ہی جھلس گئے آپ کی والدہ عباسی شہید اسپتال کی ایمرجنسی میں ہیں" وہ اتنا بتا کر پلٹ گیا۔

وہ تو جیسے اپنے حوش و حواس کھو بیٹھی بھاگ کر ساتھ والوں کے ہاں گئی' اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے ساری بات کہہ سنائی' ہمسائی جھٹ برقعہ اٹھا کر اس کے ہمراہ ہولیں۔ راستے بھر وہ اسے تسلیاں دیتی رہیں حوصلہ بڑھاتی رہیں۔

وہ وہاں پہنچی تو بڑے ماموں کو وہاں دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس سے پہلے وہ کیسے پہنچ گئے۔ عائشہ کے پرس سے جو فون نمبر برآمد ہوئے تھے ان پر فوری اطلاع کردی گئی تھی جس کے نتیجے میں بڑے ماموں وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دلاسہ دیا۔

پانچ ورکرز کی حالت بہت نازک تھی۔ جن میں عائشہ بھی شامل تھی۔ وہ گودام میں موجود کام تقسیم کر رہی تھیں۔ گودام بھی بالکل اندر کال کوٹھڑی کی مانند تھا۔

کہا جا رہا تھا کہ فیکٹری کی گاڑیوں کے لئے ڈیزل پیٹرول کے اسپیئر ڈبے وہیں دیوار کے ساتھ ہی لگے ہوئے تھے 'کوئی ڈبہ لڑھک گیا تھا رات کو کپڑوں کی گھڑیوں میں وہ رات بھر جذب ہوتا رہا کسی ورکر کی سگریٹ نے قیامت برپا کردی۔

وہ وہیں بنچ پر بیٹھ کر آیات و دعاؤں کا ورد کرتی رہی اور کانپتی رہی۔

سفید بالوں والے ایک "وارڈ بوائے" نے اس کا نام لے کر اندر بلایا تو وہ ساری جان سے لرزتی اندر پہنچی' سامنے ہی بڑے ماموں کھڑے تھے ان کے سامنے اس کی عزیز از جان ماں' پٹیوں میں جکڑی پڑی تھی۔ ان کا ایک ہاتھ بڑے ماموں کے ہاتھ میں تھا' ماں کے ہاتھ کی لرزش وہ دور سے محسوس کر سکتی تھی۔

وہ ماں کے قریب چلی آئی۔ مگر ماں کی آنکھیں تو بند تھیں۔ بند آنکھوں کی پلکیں لرز رہی تھیں۔
اس نے ہراساں ہو کر پکارا۔

"امی....!۔"

ماں نے آنکھیں کھول کر صرف ایک لمحے کے لئے بیٹی کی آنکھوں میں دیکھا۔ اتنی ویرانی اتنا سناٹا' آنکھوں میں تھا کہ اس کا دل بیٹھ گیا۔ ماں کی آنکھیں پھر بند تھیں وہ دوبارہ آنکھیں کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ مگر ان کی آنکھوں میں بیٹی کا نظارہ آخری نظارہ تھا۔

بھائی کے ہاتھ میں محروم بہن کا ہاتھ برف تھا۔

بے ہوش اسماء کو وہ بڑی مشکل سے باہر لائے

بے ہوشی کا سلسلہ رک کر نہیں دے رہا تھا۔

پورے سولہ گھنٹوں بعد جب اسے ہوش آیا تو آس پاس کئی چہرے تھے جنہیں وہ بالکل بھی پہچان نہ پائی تھی' کہ یہ سب کون لوگ ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ بڑے ماموں' چھوٹے ماموں' بڑی ممانی' ربیعہ' ہارون' سجاد' اور حماد وہ غالباً" اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر حماد فوراً" باہر چلا گیا تھا۔

چھوٹے ماموں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا

"گھبرایئے نہیں بیٹے' حالات پہ کس کا اختیار ہے خود کو مضبوط بناؤ بیٹے۔"

ان کی شفیق آواز نے گویا اس کے سارے بند توڑ ڈالے وہ تڑپ کر رو دی۔ ربیعہ نے اس کا سر گود میں رکھ لیا۔

"اسماء باجی! کیا ہم آپ کے نہیں ہیں؟۔"

"آپ اس طرح رو رو کر ہمیں بھی دکھی کر رہی ہیں۔" حماد نے بھی اسے دلاسہ دیا

"میرے ساتھ چلو بیٹا...... وہیں رہنا.... ٹھیک......" چھوٹے ماموں نے اس کے سر پر دوبارہ ہاتھ پھیرا۔

اس نے خالی اسٹول کو دیکھا جہاں حماد بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے منہ پونچھ کر آہستگی سے کہا۔

"چھوٹے ماموں! اگر میں تنہا رہنے کے قابل نہیں ہوں اور مجھے ضروری کسی کے ساتھ رہنا ہے تو میں بڑے ماموں کے پاس رہوں گی۔ ربیعہ کی وجہ سے .... آپ لوگ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

ربیعہ کو اس فیصلے سے خوشی ہوئی' وہ بڑی ممانی کے تاثرات نہ دیکھ سکی۔

چھوٹے ماموں اور سجاد نے اس کی خوشی سمجھ کر زور نہ دیا۔

ماں کی کمی نے اس کی شخصیت کو مزید چٹخا کر رکھ دیا۔

اس کی حالت پہلے سے زیادہ خوفزدہ ہرنی کی مانند ہو گئی۔

وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئی

بڑی ممانی نے ایک بار اس کے کپڑے بنانا چاہے تو اس نے منع کر دیا۔

"ممانی جان! میرے پاس کافی کپڑے ہیں۔"

وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کا روپیہ پیسہ خرچ کرائے کہ وہ لوگ اس سے بیزاری دکھانے لگیں۔

اس کا ارادہ تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کہیں سروس کر لے گی فیکٹری سے اسے کچھ پیسے ملے تھے جو اس نے پس انداز کر لئے تھے۔ اپنی کتابوں' فیسوں کے لئے' وہ چاہتی تھی جب تک وہ ان کی دست نگر ہے انہیں بہت کم تکلیف دے۔ تاکہ ان کے دل تو کم از کم اس کے لئے ہر دم وا رہیں کہ یہی تو سب سے دور تھے۔ اور یہی سب سے زیادہ قریب۔

دکھ کا مداوا نہ ہوتا تو دکھ رہتے یا پھر دنیا۔

سر پر پڑی سب کو جھیلنی پڑتی ہے۔ دکھ مقدر میں رقم ہو جائے' ہر راستہ پھر اسی سمت لے کر جاتا ہے وہ بہت سمجھ داری سے وقت کاٹ رہی تھی۔

بہت کم بات کرتی تھی کچھ زیادہ عادت بھی نہ تھی باتیں کرنے کی۔

ربیعہ سے بڑی بہنیں تو آج بھی اسی طرح فاصلے پر تھیں اور انہی کی زبانی یہ انکشاف ہوا تھا کہ دونوں ماموؤں کی والدہ الگ تھیں۔ اس کی والدہ کی مادر محترم الگ دونوں ماموں کی والدہ کا ساتھ اس کے نانا کے ہمراہ چند برسوں کا تھا جب کہ دوسری شادی عائشہ کی امی سے ہوئی اور یہ رفاقت طویل عرصے پر محیط تھی۔ اس کی سب کچھ سمجھ میں آگیا۔ سوتیلے پن نے رشتہ از خود پر تکلف کر دیا تھا۔ اسے ماں کا اپنے بھائیوں سے کم ملنا ان کی طرف مدد کے لئے نہ دیکھنا وہ سب سمجھ گئی تھی۔ کتنی عظیم تھی اس کی ماں کہ کبھی بھائیوں کو سوتیلا نہ بتایا۔

ادھر یہ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ سب باتوں سے واقف ہے بہرحال اب اس کا ذہن اس طرف سے سلجھ چکا تھا۔

سمیعہ اور ملیحہ کا رویہ تو بڑا لیا دیا سا تھا اس نے زیادہ پرواہ اس لئے بھی نہ کی کہ وہ دونوں اپنے اپنے گھر کی تھیں۔

ہارون کی عادتیں بھی کافی حد تک حماد سے ملتی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے لہجے میں

رعونت کے بجائے سنجیدگی تھی۔ رہ گئی ممانی جان' نہ اس نے ان سے خوش فہمی پر مبنی توقعات وابستہ کی تھیں نہ ان کی طرف سے دل انجانے خدشات سے لرزتا تھا۔ وہ ان سے کسی اچھے سلوک کی امید نہیں رکھتی تھیں۔ حقیقت کو قبول کرنے کا وصف اسے ماں سے ملا تھا' زندگی اپنی مخصوص جارحانہ چال چلنے لگی۔ زخم مندمل تو نہیں ہوئے وہ روز دلاسوں کے انداز بدل بدل کر خود کو سمجھایا کرتی تھی۔ وہ زندگی زندوں کی طرح گزارنا چاہتی تھی اور خود پر بہت محنت کرتی تھی۔ دوسروں کو سکھانا بہت آسان ہے مگر خود کو پڑھانا سکھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اس روز وہ گھر میں تنہا تھی' ربیعہ اور ممانی کسی تقریب میں گئی ہوئی تھیں۔

ہارون اپنی قمیض ہاتھ میں لئے اندر آگیا۔

"بھئی' یہ امی اور ربیعہ کہاں ہیں؟ سارے گھر میں ڈھونڈ لیا۔"

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"ایک تو اس گھر میں کوئی چیز مکمل اور صحیح نہیں ہے' اب یہ میچنگ شرٹ.... ایک نہیں پورے دو بٹن غائب ہیں۔"

"لائیے میں لگا دیتی ہوں' ہارون بھائی.....! آپ ایسا کیجئے کہ تمام شرٹس مجھے دے دیں میں سب کو دیکھ لوں گی۔ یعنی ادھڑی ہو یا بغیر بٹن کی' میں ٹھیک کردوں گی۔" اس نے سادہ انداز میں اپنی خدمات پیش کیں

"ارے نہیں بھئی.... تم کہاں الجھن میں پڑو گی' امی کردیں گی.... فی الحال اس شرٹ میں بٹن لگا دو۔"

وہ گیلے ہاتھ گاؤن سمیت وہیں کوچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اٹھ کر سوئی دھاگہ تلاش کیا اور بیڈ پر بیٹھ کر لرزتے ہاتھوں سے بٹن ٹانکنے لگی۔ کسی کے سامنے تو اس سے پانی بھی نہیں پیا جاتا تھا۔ خود اعتمادی تو رتی برابر نہیں تھی۔

پرنٹڈ شلوار کرتے میں ملبوس' سیاہ دوپٹہ سر پر بلکہ پیشانی تک اچھی طرح سے جمائے ہوئے وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بٹن ٹانک رہی تھی۔ دھلا دھلایا گلابی لہرماتا گندمی چہرہ اور رسیلے

غیر معمولی تراش کے بھرے بھرے ہونٹ

ہارون کو پہلی بار اس کے غیر معمولی وجود کا احساس ہوا۔

"پڑھائی وڑھائی کیسی جا رہی ہے؟۔" وہ اپنے گیلے بالوں پر مالش کے انداز میں انگلیاں چلاتے ہوئے عام سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"ٹھیک جارہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے ٹیوٹر وغیرہ کی ضرورت تو نہیں؟۔"

"نہیں.... میں نے کبھی ٹیوشن وغیرہ کا سہارا نہیں لیا۔" اس نے سوئی دانتوں تلے داب کر کہا۔

"یعنی مطلب یہ ہے کہ تم غیر معمولی ذہین ہو۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"نہیں .... میرا مطلب یہ نہیں ہے' ذہین تو میں بالکل نہیں ہوں' بس خود ہی محنت کرلیتی ہوں۔" اس نے دوسرا بٹن ٹانکنا شروع کیا۔

"مضامین کیا ہیں تمہارے؟۔"

"فزکس' کیمسٹری' اور میتھ۔"

"انجینئر بنو گی؟۔" وہ متعجب ہوا

"اپنی ایسی قسمت کہاں' کچھ بننا ہوتا تو پری میڈیکل کا انتخاب کرتی اور بائیولاجی لیتی۔ میں سائنس سے گریجویشن کرنا چاہتی ہوں' اسی لئے کہ ملازمت ذرا اچھی اور آسان سی مل جاتی ہے۔" اس نے وضاحت کی۔

"اچھا تو تم ملازمت کی نیت سے پڑھائی کررہی ہو؟۔"

وہ خاموش رہی۔

"آخر تم ملازمت کیوں کرنا چاہتی ہو' ٹھیک ٹھاک تعلیم حاصل کرو پھر شادی کرکے گھر سنبھالو' اسی میں عورت کی بقاء اور تحفظ ہے اور میرا خیال ہے ملازمت تمہارے بس کا روگ بھی نہیں ہے تم گھرداری کرتے ہوئے زیادہ....."

اسی دم کوئی پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا

وہ جھک کر دانتوں سے بٹن لگا کر دھاگہ کاٹ رہی تھی۔

"اچھی مصیبت ہے یار..... ساڑھے چھ ہو رہے ہیں اور ابھی تک تم گاؤن میں ہو' حد ہو گئی یار۔"

اسماء نے چونک کر سر اٹھایا' وہ مخاطب ہارون سے تھا اور تفصیلی نظر اس پر تھی۔

اس نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔ اخلاق نے سلام دے مارنے کا تقاضا کیا مگر اس کی ہمت نہیں ہوئی۔

"یہ لیجئے ہارون بھائی۔"

"دونوں بٹن لگا دیئے؟۔"

"جی.....؟۔"

"اچھا تو تم یہاں بیٹھے بٹن لگوا رہے تھے۔ ویسے گھر میں تو ان کی وجہ سے بہت آرام ہو گیا ہوگا کام وام کے سلسلے میں۔"

"نہیں یار..... تمہارے خیال میں ہم اتنے برے ہیں کہ اپنی فرسٹ کزن کو اپنے گھر میں یہ کام دیں گے.....؟۔ فی الحال تو یہ امی اور ربیعہ کی قائم مقامی کر رہی تھیں۔ وہ بھی اپنی خوشی سے کیوں اسماء؟"

"جی ہارون بھائی! گھر کے کام گھر والے ہی کرتے ہیں۔" اس نے آہستگی سے کہا اور رخ موڑ کر سوئی دھاگا اٹھا کر بکس میں بند کرنے لگی۔

ہارون عجلت میں باہر گیا تھا۔

"آپ کے حساب سے تو نوکر بھی گھر والوں میں شامل ہوئے۔" وہ طنزیا مسکرایا۔

"جو کام میں کر رہی تھی وہ اتنا بڑا تو نہیں اور نہ ہی معیوب' چلیں آپ مجھے نوکر ہی سمجھ لیں۔" وہ اس کے تلخ لہجے پر آزردہ ہو کر آہستگی سے گویا ہوئی۔

وہ چند لمحے اس کی پشت کو دیکھتا رہا پھر اپنی مخصوص تیزی سے باہر نکل گیا۔

"پتا نہیں ان کو مجھ سے اتنی چڑ کیوں ہے؟" اس نے آزردگی سے سوچا۔

وہ اور ربیعہ لان میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھیں کہ بلو کرولا اندر پورچ میں تیزی سے جا کر رکی ربیعہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"حماد بھائی آئے ہیں' اب تو کافی جلدی جلدی آنے لگے ہیں پہلے تو اہم تقریبات تک میں شامل نہیں ہوتے تھے۔"

آپ سے تو کوئی سلسلہ نہیں چل نکلا۔ آپ کو آئے دوسرا سال شروع ہے ان دو سالوں میں حماد بھائی از خود اتنی مرتبہ آئے ہیں کہ گزشتہ بیس سالوں میں نہیں آئے ہوں گے"

"ایسی باتیں نہیں کرتے ربیعہ۔"

"کیوں نہیں کرتے؟ ہارون بھائی کے لئے تو امی اپنی ایک بھانجی منتخب کر چکی ہیں ورنہ میں تو ان کے لئے آپ کا انتخاب کرتی۔"

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ربیعہ؟۔" اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

"آپ کو میری قسم اسماء باجی! سچ بتائیں آپ کو حماد بھائی کیسے لگتے ہیں؟' میری قسم۔"

"ارے تم یہ کیا قسمیں وسمیں درمیان میں لے آئیں' بھئی جیسے تم لوگ کزن ہو ویسے ہی حماد بھائی ہیں۔"

(میں اس قابل کہاں ہو سکتی ہوں)

"میرے لئے تو محض فرسٹ کزن ہی ہیں۔ شادی اتنے مغرور آدمی سے؟ جس کی دولت اور غرور سے ہر وقت میرے اعصاب تنے رہے خوف سے۔ ایسے شخص سے شادی تو درکنار میں تو اس کی باراتی بننا بھی پسند نہ کروں۔"

ربیعہ نے قسم دی تھی سو اس نے سنجیدگی سے دل کی بات اسے بتا دی' ربیعہ اس کی بہترین دوست بھی تھی۔ وہ اس کی دولت مند کزن تھی جس کے آستانے پر وہ عرصے سے پڑی تھی۔ لیکن اس پیاری لڑکی نے اس کی ذات کا غرور چھینا تھا۔ کبھی اپنی حیثیت جتا کر اس سے اپنی بات نہیں منوائی تھی۔

"ربیعہ! مغرور آدمی سے لوگ اس لئے کتراتے ہیں کہ وہ ان کی ذات کا غرور چھینتا ہے۔ ذات ا
غرور نعمت ہوتا ہے اگر معمولی مزدور بھی ذات کے غرور سے سرشار نہ ہو تو وہ تیشہ نہیں اٹھا سکا
مغرور لوگ دوسروں کو کمترین جتا کر ان سے کچھ کرنے کا عزم و حوصلہ چھین لیتے ہیں میں تمہارے ہاں آگئی' تو پڑھ بھی رہی ہوں' اگر چھوٹے ماموں کے پاس ہوتی تو دن میں کئی بار اس احساس کے بعد کہ میں کمتر ہوں' میرے حوصلے ٹوٹ جاتے۔ میرا ذہن اپنی ذات کی نفی کئے جانے پر الجھا رہتا۔ اور آگے بڑھنے کے بجائے پچھلا پڑھا بھی بھول جاتا۔" آج اس نے ربیعہ کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا

"اسماء باجی! حماد بھائی ذرا ریزرو قسم کے آدمی ہیں۔ مغرور نہیں ہیں.... آپ....؟"

"چھوڑو ربیعہ! جو تم نے دیکھا نہیں سُنا نہیں' اب اس پر تم سے کیا بحث کروں۔"

اس نے گویا بات ہی ختم کردی۔ پھر اندر سے ربیعہ کا بلاوا بھی آگیا۔

ایگزام کے بعد وہ فراغت سے گملے وغیرہ بنانے میں مصروف تھی اس کے بنائے ہوئے ک
گملے برآمدے میں لٹک رہے تھے۔ ان میں دھرے گملوں میں پھول بھی کھل چکے تھے۔

گھاس پر سارا سامان بکھیرے وہ بے حد مگن تھی۔

"سنو بھئی تمہیں ایمرجنسی میں پاپا نے بلوایا ہے ذرا جلدی کرو۔"

وہ بری طرح چونک پڑی' سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ جین کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔

"مم.... مجھے....؟"

"جی.... آپ کو.... ذرا جلدی کرو.... ویسے ہی مجھے بہت سے کام ہیں۔" وہ خشونت بھرے لہجے میں بولا۔

اس نے جلدی جلدی سامان سمیٹا' اور اجازت لینے ممانی جان کے پاس چلی آئی۔

"جاؤ بھائی ضرور جاؤ' حماد! بے بی کو تم خود چھوڑنے آؤ گے؟"

دیکھوں گا تائی اماں! اس نے بیزار سے لہجے میں جواب دیا۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر آئی تو اس کی گاڑی باہر تھی۔ وہ دروازہ کھولے بیٹھا تھا وہ جھجک کر بیٹھنے لگی۔

"جلدی سے بیٹھو...."

"ماموں جان کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے اس کی سمت دیکھا۔

اس نے گویا سنا ہی نہیں اور کار ایک لامتناہی سڑک پر ڈال دی۔

دور دور تک گھر کی سمت کا نام ونشان نہ تھا۔ اس نے سہم کر اس کی سمت دیکھا اس کی نگاہیں سامنے مرکوز تھیں ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

"اتنی دیر ہوگئی ہے' گھر ابھی تک نہیں آیا؟" اس کا لہجہ کانپ رہا تھا۔

گھر بھی آجائے گا' میں تمہیں اڑا کر تو نہیں لے جارہا۔ بے فکر رہو"

وہ دبی دبی سی لڑکی ایسی کھلی بات پر سٹپٹا کر رہ گئی۔

"سنو یہ ہارون نے تم سے اظہار محبت کب کیا تھا؟ پہلی بار؟"

"ہائیں....!" اسے تو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"دیکھو بھائی! تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ اس کھیل سے باز رہو' کیوں اپنا ٹھکانا کھونے پر تلی ہوئی ہو۔" اس نے تیزی سے موڑ کاٹا۔

"تائی اماں کو اس کی ہوا بھی لگ گئی تو نکال باہر کریں گی' تمہیں معلوم نہیں کہ ہارون انگیج ہے؟۔"

اس پر تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

"حماد بھائی! دیکھیں مجھ سے اس قسم کی خراب باتیں نہ کریں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"اگر ہارون یہی باتیں کرے تو اچھی ہیں؟۔ جی محترمہ؟"

"جتنے برے آپ ہیں اتنا تو شائد کوئی ہوگا بھی نہیں' پتا نہیں کیسی باتیں کر رہے ہیں ہارون بھائی آپ کی طرح نہیں ہیں۔ وہ بے چارے مجھ سے بات بھی نہیں کرتے۔"

"جب ہی تمہارے عشق میں مجنون بنا ہوا ہے۔"

"آپ کی ذہنیت ہی گندی ہے وہ ایسے نہیں ہیں' مارے شرم کے اس کی آنکھیں برس پڑیں۔"

"جی میری ذہنیت ہی گندی ہے مگر آپ ذرا ہوش سے کام لیجئے' چند دنوں میں طوفان اٹھنے والا ہے اپنی خیر منائیں۔"

"حماد بھائی'!۔" وہ مارے ڈر کے پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

"اچھا بھئی مان لیا کہ تم الو نہیں ہو اپنی عزت وجان بچانے کا آسان طریقہ ہے وہ یہ کہ تم سے اگر ہارون کے بارے میں پوچھا جائے تو صاف انکار کر دینا۔"

"ایک مرتبہ نہیں ہزار بار۔" اس نے دوپٹے سے ناک رگڑی

"جن لوگوں نے ہمیں اتنی نزدیکی قرابت داری ہوتے ہوئے جانوروں کا درجہ بھی نہ دیا میں ان کی سمت اس نیت سے دیکھنا بھی کفر سمجھتی ہوں' چاہے آپ ہوں یا ہارون بھائی۔" جانے کیسے اس کے منہ سے نکل گیا۔

"ہوں......" اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے داب کر ہنکارا بھرا

وہ اسے گھر واپس چھوڑ گیا۔ اور وہ سمجھ گئی کہ وہ اسی غرض سے بہانہ بنا کر اسے اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ اور پھر حماد بھائی کی بات سچ نکل آئی گھر میں ایک سردپن جھلکنے لگا' ممانی جان کا رویہ اس سے کھنچا کھنچا سا تھا' اس نے اپنے کانوں سے سن لیا۔ ممانی جان ہارون اور بڑے ماموں کے سامنے تیز آواز میں بول رہی تھیں۔

"تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں ہے ہارون جس کی نانی نے تمہارے باپ کو سوتیلے پن کے کچوکے لگائے' زمین و آسمان کے فرق رکھے۔ میں اس کی نواسی کو بہو بنا لاؤں۔ تمہیں معلوم ہے ہم نے کبھی ان کو اہمیت نہیں دی۔ اب اس کا کوئی نہیں تھا تو خدا ترسی میں اپنے گھر میں پناہ دی۔ اور تم مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ کیا وہ بھی تمہارے ساتھ شامل ہے؟ اس کا تو کروں گی میں دماغ ٹھیک۔"

"ممی! حد کرتی ہیں' اس کو تو کچھ بھی معلوم نہیں میں تو اپنے طور۔"

"بس کرو بھئی.... دیکھیں جبار! یا تو لڑکے کو سمجھائیں' یا اس لڑکی کو اپنے بھائی کے ہاں بھجوا دیں' وہ تو ویسے بھی اس کے اور اس کی ماں کے والہ وشیدا ہیں' سدا کے۔"

"بھئی تم ذرا تسلی سے بھی کام لیا کرو۔ اس قدر بات بڑھانے کی کیا ضرورت ہے تمہیں یہ منظور نہیں تو نہ سہی' تم اپنی بھانجی کو مانگ چکی ہو تو یہ ہارون کی غلطی ہے۔ یہ باتیں ہنسی کھیل نہیں ہوتیں۔"

"پاپا....؟۔"

"ہارون! بات زبان کی ہے تم حماقت کر رہے ہو' تمہاری ممی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" اور اس نے رات کو ربیعہ سے کہہ دیا۔

"ربیعہ! میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ ہارون بھائی میرے لئے بھائیوں کی طرح ہیں بس یہی رشتہ ہے میرے ان کے درمیان۔ ان سے کہہ دو مجھے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور نہ کریں۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔"

ربیعہ نے اس کے ستے ستے چہرے کی سمت دیکھا۔ اس کے دراز قد اور سڈول جسم کو دیکھا قدو قامت میں وہ بارعب دکھائی دیتی تھی مگر چہرہ بچوں کی طرح بھولا و معصوم تھا۔ گول چہرے کے نقوش غیر معمولی تھے۔ بلاشبہ وہ اس کی خالہ زاد سے ہزار گناہ پرکشش تھی۔ مگر وہ تو اس رشتے کے لئے خود انکاری تھی۔

ممانی کا رویہ پہلے جیسا ہو گیا تو وہ سمجھ گئی کہ ربیعہ نے اس کی بات پہنچا دی ہے۔

اس نے سکون کا سانس بھرا' تنے ہوئے اعصاب پرسکون حالت میں آ گئے۔

پھر ممانی جان نے بہت جلد شادی کی تاریخ لے لی۔ وہ کافی محتاط ہو گئی تھیں گھر میں تیزی سے تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

اس نے خود آگے بڑھ کر تیاریوں میں حصہ لیا۔ حالانکہ اس کے بی ایس سی فائنل شروع ہو گئے تھے۔ دلہن کے دوپٹوں اور قمیضوں پر خوبصورت کام بنائے۔

ہر رسم میں حصہ لیا۔ نمائندگی کے طور پر نہ سہی اپنے مخصوص خاموش اسٹائل میں۔

اس روز دلہن والوں کی طرف سے مہندی آئی تھی۔

وہ ایک طرف کھڑی شراتوں سے محفوظ ہو رہی تھی۔ سبز بروکیڈ کے چست پائجامے جالی کے

کرتے اور بڑے سے دوپٹے میں وہ بڑی محویت کے عالم میں چھیڑ خانی دیکھ رہی تھی۔

لب خود بخود دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔

کیمرے، مووی الگ روشنیاں برسا رہے تھے۔

وہ سب میں نمایاں تھی، پھر اپنی دلکشی سے بے نیاز بھی تھی۔

کتنے کیمرے بار بار اس کی سمت متوجہ ہوئے تھے وہ بے خبر لڑکیوں کے "خبر لینے والے" انداز کے گانوں پر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ربیعہ نے کئی بار اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"اسماء باجی! آپ بھی گائیے نا ہمارے ساتھ۔"

مگر اس نے ہنس کر ہاتھ چھڑا لیا۔

"ارے بھئی یہ جو سبز کپڑوں میں مس یونیورس کھڑی ہیں، دوست، ان کا ذرا مزے دار سا کلوز اپ تو محفوظ کرو ہمارے لئے۔"

اچھے خاصے ڈیل ڈول کے مالک ایک صاحب نے کیمرہ اٹھائے ہوئے نوجوان کی پشت سہلائی۔

"اور انعام کیا دیجئے گا صاحب!۔" وہ فوکس سیٹ کرتے ہوئے ہنس دیا۔

"ان۔" کے علاوہ جو مانگو!" وہ بڑے عاشقانہ انداز میں گویا ہوئے۔

پیچھے کھڑا حماد فلش میں سیل فٹ کر رہا تھا۔ مارے جذب کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کھٹاک سے سیل چیمبر بند کیا۔

"جاؤ بھئی تائی اماں کہہ رہی ہیں ذرا ملازمہ کا ہاتھ بٹاؤ کچن میں۔"

وہ گانوں میں بے حد مگن تھی۔ ایک دم چونک کر اس کی سمت متوجہ ہوئی۔

سرمئی قمیض شلوار میں ملبوس حماد کا چہرہ اسے غیر معمولی سرخ محسوس ہوا۔

"میں....؟۔"

"جی.... آپ.... اب جا بھی چکئے....۔" وہ جھلایا۔

وہ دل مسوس کر محفل سے کچن میں چلی آئی، ملازمہ مہمانوں کے لئے سینڈوچ پلیٹوں میں سجا رہی تھی۔

"لاؤ بھئی.... کیا باقی رہ گیا ہے؟۔"

"سب کچھ تیار ہو گیا ہے بی بی، بس سینڈوچ رہ گئے تھے"

"لو بھلا، ممانی جان نے تو مجھے تمہارا ہاتھ بٹانے کے لئے بھیجا ہے۔" اسے سخت کوفت ہوئی۔

"سب تیار ہے آپ جائیں بی بی، میں چھمو کے ساتھ مل کر میزوں پر لگا دیتی ہوں۔"

وہ سوچتی ہوئی باہر آ گئی۔

ایک تو یہاں کسی کی سمجھ نہیں آتی۔

ایک خیال اسی دم بجلی کی طرح کوندا کہ حماد نے اسے وہاں سے ٹالا ہے

"مگر کیوں؟۔" وہ یہ نہ جان سکی۔

چھوٹے ماموں جان ہارون اور دلہن کی دعوت کرنا چاہتے تھے ایک بیٹی دمام میں تھی۔ ایک شکاگو میں سجاد اپنی بیوی کو لے کر جا چکے تھے اپنے "ٹھیئے" پر لہٰذا گھر پر کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اس شام انہوں نے اسے بلوایا تھا کہ وہ آ کر ملازموں کے "سر پر" کھڑی ہو جائے۔

بڑے ماموں کو ان کا فون آ گیا تھا، وہ صبح آفس جاتے ہوئے اسے وہاں چھوڑ آئے تھے اور کہہ گئے تھے بعد دوپہر تمہاری ممانی بھی آ جائیں گی دعوت شام کی تھی۔

بڑی ممانی کیسی ہی سہی مگر وہاں اسے پھر بھی آزاد کا احساس ہوتا تھا ایک تو بغیر مکین گھر اس پر احساس اجنبیت، کافی دیر تو وہ بولائی بولائی پھرتی رہی مگر جب ربیعہ کالج سے سیدھی چھوٹے ماموں کے ہاں آ گئی تو اس کے دل کو اطمینان سا ہوا۔ خانساماں کچن میں خوشبوئیں بکھیر رہا تھا، شام کے بعد انہوں نے کراکری و کٹلری منتخب کر کے ملازم کو صاف کرنے کے لئے دی۔ کافی کے خوبصورت مگ نکال کر کچن میں رکھے اور ہدایت کی کہ کھانے کے بعد انہی میں کافی دینا۔ ہارون کے سسرالی بھی دعوت میں مدعو تھے۔ اس لئے ان دونوں نے کافی محنت کی دوسرے ان کی صلاحیتوں کا امتحان بھی تھا۔

وہ ڈائننگ ٹیبل کے لئے پھولوں کا گلدستہ بنانے لان میں لائی تھی۔

انگریزی پھولوں اور دیسی پھولوں کے ملاپ سے اس نے نہایت دل کش گلدستہ بنایا۔ جسے سیٹ

کرتی ہوئی' برآمدے کے زینے طے کر رہی تھی۔ کہ تب ہی اس کی خود اعتمادی ڈانواں ڈول ہو گئی' سفید پینٹ شرٹ میں وہ اسے چور نظروں سے دیکھ رہا تھا بظاہر وہ گاڑی لاک کر رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" سامنے آ گیا تو اسے کہنا پڑا

"وعلیکم السلام' بھئی یہ کہاں نظر آ رہی ہیں؟۔" اس کی خوبصورت بھاری آواز ابھری اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"آج ہارون بھائی اور ان کی دلہن کی دعوت ہے ناں۔" اس کی مدہم آواز ابھری۔

"اور آپ اس دعوت میں کس قدر اہتمام سے شامل ہو رہی ہیں۔ لباس دیکھیے اپنا۔"

وہ اس کے بے حد نزدیک تھا۔ وہ اس خاندان کی تمام لڑکیوں میں نمایاں قدو قامت کی حامل تھی۔ اس کے باوجود حماد کے کان تک پہنچ رہی تھی۔ اور حماد کی اتنی قربت پر اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا اس وجود کے سائے میں وہ خود اپنی ذات سے ڈر گئی تھی۔

احساس کمتری پھر عود کر آیا۔ ظاہر ہے انہیں میرا لباس کیوں نہ کھٹکے گا پتا ہے کہ میرا تعلق غریب خاندان سے ہے۔ اس میں اتنا اعتماد نہیں تھا کہ اس کے سامنے سے گزر کر اندر چلی جائے خاموشی سے اس کے ٹلنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"کپڑے تبدیل کیجئے تاکہ گھر میں کسی تقریب کا گمان ہو۔"

"میں کپڑے نہیں لائی ہوں یہی ٹھیک ہیں' میں مہمانوں کے سامنے نہیں آؤں گی' بے فکر رہیے۔" خدا معلوم کیسے کہہ دیا اس نے۔

اسی دم ربیعہ نے اسے آواز دے لی تھی۔ وہ گلدستہ سونگھتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی اور اس سمت بڑھ گئی جہاں سے ربیعہ کی آواز آئی تھی۔

سلاد تیار کرتے ہوئے کتنے آنسو اس نے خانساماں سے نظر بچا کر اپنے دوپٹے سے صاف کئے۔ آخر جو لوگ امیر ہوتے ہیں وہ مغرور کیوں ہوتے ہیں؟ دوسروں کا دل کیوں دکھاتے ہیں؟ جب وہ جانتے ہیں کہ غریب لوگ ان جیسے کپڑے نہیں بنا سکتے۔ تو وہ جتاتے کیوں ہیں؟ جب کہ یہ تو میرے حقیقی ماموں زاد ہیں اور جانتے ہیں کہ یتیم اسیر بھی ہوں میرے تو سائبان ٹوٹ چکے ہیں۔

شام سات بجے تک مہمان آ چکے تھے۔ ممانی جان ذرا پہلے آ گئی تھیں۔

سب کھانے کے کمرے میں موجود تھے سوائے اسماء کے

وہ کچن میں قہقہے' آوازیں سن رہی تھی۔

میری حیثیت کسی خادمہ سے کم نہیں' کام ہو گیا ہے۔ سب خوش ہیں' مصروف ہیں۔ کریڈٹ خانساماں لے رہا ہے۔ میں ایسے میں کیوں کر کسی کو یاد آ سکتی ہوں؟

اور وہ چھوٹے ماموں جو سب سے زیادہ میرا خیال کرتے ہیں۔ اس وقت اپنے ہم پلہ لوگوں میں کتنے مگن ہیں۔

"بی بی۔۔۔۔"

"خدا انسان کو زندگی دے تو عزت والی۔"

"بی بی۔"

اس نے دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں

"بی بی۔"

"کیا ہے بھئی؟۔" وہ اپنے سے کم مایہ پر جھلا کر مڑی۔

"بڑے صاحب بلا رہے ہیں آپ کو۔"

"میں کیا کروں گی وہاں؟۔"

"وہ آپ کو بلا رہے ہیں' کہہ رہے ہیں فوراً آئیں۔"

وہ دوپٹہ درست کر کے نظریں جھکائے اندر چلی آئی۔

حماد نے اس کی سرخ سرخ روئی روئی آنکھیں دیکھ لی تھیں۔

بلکہ وہاں بیٹھے سب لوگوں نے اس کی بے حد خوبصورت آنکھیں' بہت متورم اور سرخ محسوس کی تھیں۔

"بھئی رو رہی تھیں کیا؟۔" ربیعہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں تو۔۔۔ سلاد کے لئے پیاز کاٹی تھی ناں۔"

"بھئی' ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا منع ہے؟۔" چھوٹے ماموں نے پوچھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"بری بات بیٹا جتنی بھوک ہے کھالو سب کے ساتھ۔" بڑے ماموں نے محبت سے ٹوکا' تب وہ جھجکتی ہوئی ان کے برابر میں بیٹھ گئی۔

"صبح سے کام کر رہی ہو ابھی بھی بھوک نہیں۔" انہوں نے ڈونگہ اس کی سمت سرکایا۔

"ربیعہ! تمہیں بہن کا ذرا خیال نہیں خود آکر بیٹھ گئیں۔"

ممانی جان نے بھی شوہر کے سامنے بے پناہ شفقت کا مظاہرہ کیا۔

"امی! ایک تو اسماء باجی میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آئیں۔ سچ ہم ان سے اس قدر بے تکلف ہیں بالکل فیملی ممبر' مگر یہ تو ہم سے بے حد اجنبیت سے پیش آتی ہیں۔ بہت ہی لیا دیا سا انداز ہے۔ مغرور لوگوں جیسا۔" ربیعہ نے اس پر شکایتی نظر ڈال کر جانے کب کب کا حساب چکایا

سب ہنس دیئے۔

ہارون کی بیوی نے اسے بے حد پسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔

جب وہ بڑے ماموں کے ہمراہ جانے کو تیار ہوئی تو چھوٹے ماموں نے کہا۔

"کبھی یہاں بھی رہو' ہم تو یہ سوچ کر زور نہیں دیتے کہ تم یہاں تنہا رہ کر بور ہو گی مگر کبھی "بور" ہونے کا بھی پروگرام بناؤ۔"

وہ شرما کر مسکرا دی۔

"رہ جاتی ہوں ماموں جان! اگر آپ۔" ربیعہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"بھئی یہ گھر تو ابتدائی جنت ہے' جب آدم اکیلے تھے تم تو بور ہی۔........"

"بھئی تمہارے چچا کی پسلی تو چاک ہو گئی' اب بھائی ہی بچا ہے۔" ممانی نے ہنس کر ٹکڑا لگایا' اور خوبصورت اور خاموش حماد کو شرارت سے دیکھا۔

"اب یہ جنت بھی مکمل کرنا ضروری ہے' بتائیے آپ کی حوا کہاں سے لائیں؟۔"

ربیعہ نے کہا مگر وہ خاموش کھڑا رہا۔

"بتادو یار! پھر اتنی فرصت سے جانے کب یہ سب جمع ہوں" ہارون نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے چور نگاہوں سے اسماء کو دیکھا اور ہارون کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

"خدا کرے ہارون جسے دل مانگتا ہے وہ تقدیر بھی ہو۔"

بڑے ماموں گاڑی میں بیٹھنے لگے۔ تھے اور ان کی طرف سے توجہ ہٹالی تھی۔

ہارون نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"فرصت سے پوچھوں گا چھپے رستم۔"

اور اسے فرصت سے پوچھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

صرف ڈیڑھ ماہ ہی گزرا تھا جب وہ ربیعہ کے "بیوٹیشن ایکسپرئیس" کا شاہکار بن کر حماد کے حجلہ عروسی میں تھی۔ وہ بانکا شہزادہ اسے سامنے دیکھ کر وارفتگی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے بات کے سچے اور قول کے پکے لوگ بہت متاثر کرتے ہیں۔ اب یہی دیکھو آج جب میں بارات لے کر تایا ابو کے ہاں پہنچا تو تم میری بارات میں شریک نہیں تھیں۔ گویا میری باراتی بننے کی ذلت بہرحال نہیں اٹھائی۔"

اور اسے دھڑکتے دل کے ساتھ غصے پر بھی قابو پانا پڑا۔

یہ ربیعہ کی بچی' اسے وہ شام یاد آگئی جب اس نے ربیعہ سے کہا تھا کہ وہ حماد کی دلہن بننا تو کجا اس کی باراتی بننا بھی پسند نہ کرے۔

"دیکھو اسماء بیگم! سب عشق کرنے والوں کے انداز ایک جیسے نہیں ہوتے اس لئے کہ عشق کی تربیت کسی انسٹی ٹیوٹ میں نہیں دی جاتی۔ بعض دفعہ انسان اپنے مقابل کو غلط سمجھ بیٹھتا ہے۔ ہوتے ہوں گے لوگ مغرور' مگر عموماً" لوگ غلط فہمی میں مارے جاتے ہیں' غریب آدمی چڑچڑا اور تلخ ہو تو کہا جاتا ہے معاشی پریشانیاں ہیں۔"

امیر آدمی سخت مزاج ہو تو اسے مغرور کہا جاتا ہے۔

انسانوں کو پڑھانا آسان نہیں ہوتا ہم خود کو کمتر و حقیر سمجھ رہے ہوتے ہیں تو فرض کر لیتے ہیں ہمارے سامنے بیٹھا ہوا شخص بھی ہمارے متعلق یہی سوچ رہا ہے۔

نہ میں مغرور ہوں، نہ سخت دل، بس ذرا عشق کے میدان میں اناڑی ہوں، مجھے تو وہ رو
بسورتی لڑکی آج بھی اپنے دل میں بند محسوس ہوتی ہے۔ جو پھوپھو سے کہہ رہی تھی کہ ان مغ
لوگوں کے درمیان میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

"اگر میں تمہارے گھر کے پھیرے لگاتا، روز تمہارے دیدار کو پہنچتا تو تب تم شاید تم میر
جذبوں پر اعتبار کرتیں۔"

"اسماء بیگم! بعض اوقات عشق کا چہرہ ایسا بھی ہوتا ہے۔"

اسماء کو ایسا محسوس ہوا وہ بہت بڑی دولت مند ہے، محبت اس کے پاؤں کے نیچے تھی۔

رائیگاں تو ہے

"آج وہ آرہا ہے" آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے اس نے سہم کر سوچا۔

"کیا پھر آنکھ مچولی چلے گی؟۔" وہ ہنسی.... "مگر اب آنکھ مچولی کے دن کہاں.... جانے کتنے بچے ہوں گے اس کے.... آہ!".... تب کتنے ہی سفاک لمحے... خاموش سرد مہر لمحے اس کا کلیجہ چھیدتے گزر گئے.... چند قطرے رخساروں پر لڑھک آئے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر آئینے میں نظر ڈالی.... چہرے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے وہ گردن سے نیچے تک ہاتھ لے آئی جہاں پسینے کے مسکین قطرے اس سے پہلے پہنچ چکے تھے۔

ابھری ابھری ہڈیاں نمایاں ہیں۔ پسینے کے قطرے بھی جانے کتنے نشیب و فراز سہہ کر راستہ چلنے لگے تھے۔ ایک وہ بھی وقت تھا جسم کے اس حصے میں پور دھنس جاتی تھی۔.... قمیض کا گلا چپک کر جسم کا ہی حصہ بن جاتا تھا۔

"سب کچھ ضائع ہوگیا....؟۔ کہ تم نے ضائع کردیا.... مگر وہ اپنے آپ کو خوش باش ظاہر کرے گی.... اس کی بیوی سے محبت سے ملے گی.... ذرا ملول نہ ہوگی.... پھر وہ.... بال سلجھانے میں مصروف ہوگئی۔"

کان کے قریب سرگوشی ابھری "آپ پر تو دو چوٹیاں بہت سجتی ہیں بالکل چھوٹی سی بچی لگتی ہیں"
اور اس نے.... غیرارادی طور پر بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا۔ مگر چمکتے ہوئے چاندی کے تار مسکرادیئے تو وہ جھینپ گئی۔

"اب بھلا دو چوٹیوں کی عمر کہاں....؟۔"

پھر اسے جانے کیا ہوا اس نے برش آئینے پر دے مارا.... "تم نے میری زندگی برباد کر دی ہے.... تم نے مجھے ضائع کر دیا ہے.... خاک کر دیا ہے مجھے.... میں دیکھوں گی تم کس طرح خوش رہو گے ضائع میں تمہاری بیوی کو بتاؤں گی.... اس کے دل میں کسی کی پختہ محبت نہیں' یہ شخص ہرجائی ہے.... کھلاڑی ہے...."

وہ زمین پر بیٹھ کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

......*

"ارے دماغ تو صحیح ہے تمہارا....؟" وہ اپنی ماموں زاد پر بھڑک کر بولی۔

"میرا دماغ بالکل صحیح ہے.... تم نے ساتھ دینا ہے تو دو ورنہ وہ تو کہہ رہا ہے ہم کورٹ میرج کر لیں گے...."

"کورٹ میرج.... اس کے چھکے چھوٹ گئے۔"

"رر.... رضیہ....! میری بہن.... میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں.... اس میں کسی کا بھی بھلا نہیں.... تمہارا بھی نہیں...."

"بلا سے.... اس کی محبت میں مجھے اپنا آپ مٹانا بھی منظور ہے۔" اور وہ راضیہ کی منہ زوری پر خوفزدہ سی دیکھنے لگی۔

"ما.... ماموں جان تجھے جان سے مار ڈالیں گے...."

"تو.... مار ڈالیں۔"

"دیکھو راضیہ! یہ شریف لڑکیوں کے طریقے نہیں۔"

"تو مت کہو مجھے شریف لڑکی۔"

وہ گنگ سی رہ گئی.... پھر نہایت برا مان کر بولی "محض ایک خاکی انسان کی خاطر اپنے آپ کو ذلیل کہلوانا بھی پسند کر رہی ہے"

"آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے.... محترمہ جمیلا عباس صاحبہ! زندگی خاکی انسانوں کے ساتھ

ہی گزاری جاتی ہے۔ خاکی انسان ہی باہم مل کر ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ غالباً آپ.... پری زاد یا کسی جن بھوت سے نکاح پڑھوائیں گی" اس مرتبہ راضیہ بھی تھوڑی برہم ہو گئی۔

"راضیہ! وہ دو بچوں کا باپ ہے.... اس کی بیوی کا خیال نہیں تو اس کے بچوں پر ہی رحم کرو...." وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

"محبت ہی کرنی تھی تو کسی کنوارے سے کر لیتیں.... کمی تو نہیں یہاں۔"

"سجو! محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ بائرن کہتا ہے "اپنے پہلے جذبے میں عورت اپنے چاہنے والے کو چاہتی ہے اس کے بعد اسے اس سے محبت ہو جاتی ہے۔" سجو تجھے کیا معلوم! اس نے مجھے کس قدر ٹوٹ کر چاہا ہے اتنی شدتوں سے کہ ایسی شدتیں ہر لڑکی کا مقدر نہیں ہوتیں۔ تو کیا سمجھتی ہے.... میں پکے پھل کی طرح اس کی پہلی نظر میں.... سجو میں نے اسے ہر زاویئے سے ٹٹولا ہے۔ وہ میرا خالہ زاد ہے ظاہر ہے آزادی سے گھر میں آتا جاتا ہے۔ جب اس نے پہلی مرتبہ مجھ پر اپنے جذبے کا خاموش اظہار کیا تھا میں بری طرح بھڑک گئی تھی.... میں نے سخت لعن طعن کیا تھا۔ سجو! میں نے اسے.... اس قدر ذلیل کیا تھا کہ بیوی کی موجودگی میں وہ.... مگر اس پر ذرا اثر نہ ہوا.... وہ ہر موقع پر بالکل خاموش ہو رہا.... اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنی اس قدر توہین پر میرا منہ نوچ لیتا۔

جب میں نے اسے پہلی مرتبہ بہت برا بھلا کہا.... تب پتا ہے اس نے کہا تھا.... "مجھے بھی یہ اچھا لگتا ہے...." اس کی شدتوں نے مجھے ہرا دیا تھا.... سجو تو نے تو دیکھا ہے ناں.... کتنی شاندار شخصیت ہے.... باطنی طور پر بھی وہ نہایت پاکیزہ ہے"

"پاکیزہ....!" سجو استہزائیہ مسکرائی۔

"پہلے کون سا تم آسمان پر رہتی تھیں۔ اسے شادی سے پہلے ہوش نہیں آیا تھا' آخر کو تمہارا خالہ زاد ہے کوئی دشواری بھی نہیں تھی۔ ارے' یہ مرد بڑے چالباز ہوتے ہیں.... سجو...." جب رحمٰن کی شادی ہوئی میں تیرہ سال کی تھی تم لوگ تو اس وقت تک کراچی نہیں آئے تھے۔ اس لئے تجھے معلوم نہیں پورے تین سال سے وہ میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ ان کی بیوی پر بھی سب

عیاں ہے جب ہی تو میں وہاں نہیں جاتی.... اور اب تو یہ معاملہ سب پر کھل چکا ہے وہ بھی نہیں آتے انہوں نے مجھے کئی بار باہر ملنے کو کہا' مگر مجھے یہ پسند نہیں کہ شادی سے پہلے مرد کے اشارے سیدھے مطالبات مانو....! اس طرح عورت کا اسرار بھی ختم ہوتا ہے۔ وہ میرے انکار پر ناراض ہوگیا تھا۔ ابھی چند روز ہوئے وہ ایک جنرل اسٹور پر ٹکرا گیا تھا مجھے دیکھ کر اس نے فوراً" ایک پرچہ پر لکھا اور میری طرف کھسکا کر باہر نکل گیا.... یہ دیکھ...."

راضیہ نے تکیئے کے نیچے سے ایک پرزہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے اپنا ہم خیال بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔

تب اس نے تحریر کردہ سطور پر نظر دوڑائی

Your Heart is Not Piece Flesh'You Are Callous

(تمہارا دل گوشت کا ٹکڑا نہیں' تم پتھر دل ہو)

"اب تو ہی کہہ یہ دل ٹوٹنے والی باتیں نہیں ہیں....؟ کون سی عورت ہے جو اس کی دیوانگی پر فدا پاگل نہ ہوگی.... سچو.... کہہ دے امی سے.... میرا وہی فیصلہ ہے میں صرف رحمٰن کی ہوں....." چٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"راضیہ تو پاگل ہوگئی ہے.... بے کار کی ڈرامے بازی کررہے ہیں رحمٰن بھائی.... سب کی عزتیں خاک میں مل جائیں گی.... ممانی جان اپنی بہن سے ہمیشہ کے لئے کٹ جائیں گی۔"

"اس نے تو شرافت سے رشتہ مانگا ہے مسئلہ تو گھر والے خود بنا رہے ہیں تو ہم کیا کریں' یہ راستہ تو گھر والے خود دکھا رہے ہیں۔ اولاد کی خوشیوں کی انہیں ذرا پرواہ نہیں بس لوگوں کی فکر ہے۔"

"سب درست کہہ رہے ہیں' واقعی یہ غلط قدم ہے۔ اور مجھے یہ غلطی بہت پسند ہے چلو اٹھو باہر لان میں بیٹھتے ہیں' کچھ تیرے دماغ کی گرمی بھی کم ہوگی....۔" راضیہ ہمیشہ کی طرح خوش باش تھی اور پورا گھر بکھر رہا تھا۔

وہ کھڑی ہی ہوئی تھی کہ چند لڑکے لڑکیاں شور کرتے اندر آگئے۔

"آنٹی نے ٹھیک کہا تھا کہ راضیہ اپنے کمرے میں ہوگی۔" ان میں سے ایک لڑکی بولی' پھر سب

نے سجیلہ کی سمت سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"یہ میری سب سے بڑی پھوپھو کی صاحب زادی ہیں۔ ہمارے پھوپھا ریٹائر ہوگئے ہیں اور اب پنڈی سے کراچی آگئے ہیں اور یہیں کاروبار کررہے ہیں۔ آسیہ باجی آپ کے برابر والا گھر ہماری پھوپھو ہی کا تو ہے۔" راضیہ ایک تسلسل سے بولی۔

سب کافی بے تکلف اور خوش باش تھے۔ راضیہ کے گھر بہت آنا جانا تھا راضیہ نے ان سب کا تعارف کرایا۔

"یہ ہارون بھائی ہیں۔" اس نے مسکراتے لبوں والے پروقار سے مرد کی جانب اشارہ کیا

"ان سے چھوٹی یہ آسیہ باجی ہیں' یہ نازیہ اس سے چھوٹی سعدیہ اور مسخرا مامون ہے۔ ہم لوگ بالکل ایک فیملی کی طرح رہتے ہیں۔"

"ارے بھئی راضیہ! تم نے یہ نہیں پوچھا کہ بیک وقت ہم پانچوں کا نزول کیوں ہوا ہے۔"

"کوئی نئی بات.... یہ نزول تو سارا سال جاری و ساری رہتا ہے آج کی کیا بات...." راضیہ ہنسی

"دراصل آج ہارون بھائی کی چھٹی تھی۔ تو ہم نے سوچا آج ایسے ذرا چکر لگا آئیں.... کون وغیرہ کا بھی پروگرام ہے سوچا تمہیں اور نازیہ کو بھی لے چلیں.... اور اب تو آپ بھی چلیئے لطف رہے گا۔" سعدیہ بات کرتے کرتے اس کی طرف پلٹ کر بولی۔

"شکریہ! آپ لوگ جائیں مجھے چند ضروری کام تمام کرنے ہیں۔"

"اچھا راضیہ! صبح ضرور آنا آپ لوگ بھی آیئے گا...." اس نے اخلاقاً" دعوت دی۔

اس کے وہاں سے جلد اٹھ آنے کی وجہ اس شخص کی نگاہیں بھی تھیں جسے سب ہارون بھائی کہہ رہے تھے۔

اس شخص کو آج سے پہلے بھی اس نے آصف بھائی کے ساتھ شطرنج کی بساط بچھائے ڈرائنگ روم میں بیٹھے دیکھا تھا۔

راضیہ کے ہاں ان کا بہت آنا جانا تھا۔ راضیہ انہیں ایک دو مرتبہ سجیلہ کے ہاں لائی مگر وہ کبھی ان کے گھر نہیں گئی۔ وہ جلد گھلنے ملنے والی طبیعت نہیں رکھتی تھی۔ ایک دم کسی سے بے تکلف

ہو جانا اسے پسند نہیں تھا۔

آج کل وہ راضیہ کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی۔ کہ خدا معلوم کب اس کے ذہن میں خناس سما جائے۔ ممانی جان راضیہ سے سخت خفا تھیں مگر اس کا احساس بھی چند قریبی لوگوں کو تھا۔ انہوں نے راضیہ سے بات چیت بند کر رکھی تھی۔ اور اس شخص نے الگ ڈسٹرب کر کے رکھ دیا جب اس کی آنکھیں پیغام رسا بنیں تو اس نے وہاں جانا بہت کم کر دیا ان مردوں کو کوئی کام نہیں تانکنے جھانکنے کے سوا۔

راضیہ کی وجہ سے اس کا نزلہ آج کل تمام مردوں پر گر رہا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنے بڑوں کی روایات کا احترام کرنے والی مشرقی لڑکی تھی۔ اور یہ شخص تو جیسے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔

آصف بھائی کے ایک سالہ بیٹے کی سالگرہ تھی گھر گھر کے تھے۔ بس چھوٹی سی تقریب تھی۔ تالیوں کی گونج میں جگنو نے کیک کاٹا۔ تقریب کے بعد لڑکے لڑکیوں میں بیت بازی کا مقابلہ شروع ہوا وہ او آصف اس میں شامل نہیں تھے۔ وہ تو یہ کہتے ہوئے دور جا بیٹھے۔

"شادی سے پہلے سینکڑوں شعر یاد تھے انہوں نے بھابھی کی طرف دیکھ کر ایک آہ سرد کھینچی "اب اگر کوئی یاد بھی ہے تو وہ بھی بے وزن' بھابھی ایک خوش مزاج عورت تھیں۔ شوہر کی بات پر مسکرا دیں۔"

"ہارون بھائی....! پہلے آپ شروع کریں۔" نازیہ بولی۔

ہارون نے کشن کہنی کے نیچے رکھا اور کھنکار کر گلا صاف کیا۔

میں حرف حرف حقیقت ورق ورق سچا
مگر یہ شرط ہے مجھے غور سے پڑھو جاناں

نون کا شعر.... چند لمحوں کے لئے سکوت چھا گیا۔

"آگیا....." ماموں نے اعلان کیا پھر نہایت سنجیدگی سے گویا ہوا

نکالا مجھ کو جنت سے فریب زندگی دے کر
دیا پھر شوق جنت کا' یہ حیرانی نہیں جاتی

سب بے ساختہ ہنس پڑے بلاشبہ کا درد تھا مامون کے لہجے میں

پھر ایک دم راضیہ بولی "منیبہ صاحب....!"

یارب میرے نصیب کا کچھ فیصلہ تو کر
میں یونہی ڈوب جاؤں یا ساحل بھی آئے گا

اس نے راضیہ کی طرف دیکھا تو وہ نگاہ چرا گئی۔

معاً "ہارون کی آواز ابھری "توجہ چاہتا ہوں"

ارے ہارون بھائی! آپ تو اس طرح سنا رہے ہیں جیسے اپنے تخلیق کردہ ہوں...." ماموں نے کہا تو ہارون بولے۔

"سب میری سوچ کے ترجمان ہیں کوئی مجھ سے پہلے کہہ گیا تو کیا کروں...." سب ہنس دیئے الف کا شعر....

'ایک تیری تمنا نے کچھ ایسا نوازا ہے
مانگی ہی نہیں جاتی اب کوئی دعا ہم سے

انہوں نے نہایت گہرے انداز میں اسے دیکھا تو نروس سی ہو گئی' وہ تب اس کی نظر پہلو میں بیٹھی مہکتی راضیہ کے پاؤں پر پڑی۔ اسے یاد آیا کہ وہ تقریباً" دو ماہ سے ناصح کا کردار بخوبی نبھا رہی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ پر اعتماد سی ہو کر بیٹھ گئی۔

اور پھر اس نے ایک حرکت کی جیسے ہی ہارون نے شعر پڑھنا چاہا وہ اس شعر کی تفسیر بن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

مغرور تھا کمال سخن پر بہت حفیظ
ہم نے بھی واہ واہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

سب نے بہت روکا مگر وہ امی کو زبردستی لے کر گھر آ گئی۔ سونے سے پیشتر اس نے راضیہ کے متعلق سوچا.... "خدایا اس لڑکی کو عقل دے رحمٰن بھائی کی بیوی کا خدا معلوم کیا حال ہو گا پتا نہیں آخر

رحمن بھائی نے کس طریقے سے ان سے دوسری شادی کی اجازت لی ہے.....؟"

......*

دونوں بہنوں کے ذہن ماؤف ہو چکے تھے ایک طرف بیٹا نہایت گستاخی سے ماں سے خطاب کرتا تھا۔

"جب صالحہ نے اجازت دے دی ہے تو آپ کو کیا تکلیف ہے؟۔"

دوسری طرف بیٹی ماں سے کہہ رہی تھی کہ وہ کچھ کھا کر سو رہے گی۔

"تو مرجاؤ....." ماں نے نہایت سنگدلی سے کہا "قصور تمہارا ہی ہے وہ اپنی بیوی کے ساتھ ابھی تک ٹھیک ٹھاک رہ رہا تھا...."

"امی....!۔" راضیہ سسک پڑی.... "سچ امی! میں نے انہیں نہیں بھٹکایا۔ میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں...."

"ضرورت بھی نہیں مجھے یقین دلانے کی' سب تمہاری حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔" سجیلا کی ماں نے سمجھایا مگر وہاں ایک ہی گردان تھی۔

"نہیں پھوپھو۔"

تب ماموں جان بھڑک اٹھے "میں اسے گولی مار دوں گا" راضیہ پر کوئی اثر نہ ہوا' سجیلہ بیسویں صدی کا عشق دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

سب باتیں..... دلائل..... دھمکیاں..... خوشامدیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ انہوں نے کورٹ میرج کرلی تھی۔ جب مغرب کے وقت راضیہ نے فون پر اطلاع دی تو اسے غش سا آگیا۔ ایک لفظ منہ سے نہ نکل سکا۔ ممانی جان نند سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ ان کی سگی بہن نے انہیں کیا کچھ نہ کہا تھا۔ امی نے بھاوج کے سامنے دل کو قابو میں رکھا۔ مگر گھر آکر پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ آج جس شخص کی عزت خاک میں مل گئی تھی وہ ان کا ماں جایا تھا۔

ان دنوں سجیلہ سے چھوٹا فراز بھی ٹیکسلا سے چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ اس نے سر جھکا کر اتنا کہہ دیا "راضیہ باجی نے یہ اچھا نہیں کیا۔"

ایک روز راضیہ نے اسے فون کیا کہ وہ رحمن کے ساتھ سعودی عرب جا رہی ہے تو اگر وہ ملنا چاہے تو اسے پتے پر مل لے۔ تب اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا تھا "میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی' آئندہ مجھے فون مت کرنا"

وہ شاپنگ کے لئے فراز کے ہمراہ بوہری بازار آئی تھی۔ فراز اس سے تین سال چھوٹا تھا مگر قد میں تین ہاتھ اونچا ہو گیا تھا۔

"وہ کپڑا پسند کر رہے تھے۔ کہ معاً" فراز اٹھ کھڑا ہوا۔"

"السلام علیکم ہارون بھائی!۔"

"وعلیکم السلام بھئی.... کیا لے رہو ہو.....؟۔"

اس نے مطلق توجہ نہ دی اور ایک پینٹ پیس اٹھا کر اسے اپنا ہم پسند بنانے کے لئے دلائل دینے لگی۔ مگر وہ بھی ایک ہی تھا۔ اسے دوسرا پیس پسند آگیا تھا مگر اس نے دیکھا وہی پینٹ پیس ہارون پیک کروا رہا تھا۔ وہ ادائیگی کے بعد سرد چہرے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہارون فراز سے باتوں میں مصروف تھا۔ محبوب کے قرابت داروں سے تعلق بڑھانا بھی محبت کے اصولوں میں شامل ہے۔ اور ہارون اس اصول پر نہایت سنجیدگی سے عمل پیرا تھا۔ اور وہ بھی سخت کوفت محسوس کر رہی تھی۔

"بھئی آخر ہم آپ کے پڑوسی ہیں' اور آپ کی اپیا ہیں کہ سلام تک کرنا پسند نہیں کرتیں۔"

غالباً" اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا اب وہ اس کی ذات پر آگیا تھا۔ یہ بات انہی جذبوں میں لپٹ کر پہنچی جن جذبوں میں سمو کر کہی گئی تھی۔ وہ سب کچھ محسوس کرتی تھی کہ عورت تھی جو مرد کی نظر پہچاننے میں دھوکہ نہیں کھاتی۔ اور اس معاملے میں نہایت حساس واقع ہوئی ہے۔

"آؤ' اب گھر ہی تو جانا ہے ناں؟۔"

"ابھی کہاں ہارون بھائی! ابھی تو اپیا کی جانے کتنی شاپنگ باقی ہے۔ ویسے ہمارے پاس اپنا گھوڑا ہے۔" فراز نے اپنی ہنڈا کی سمت اشارہ کیا

......*

راضیہ کے اس اقدام سے تمام ماحول پر ایک تکلیف دہ تاثر چھا گیا تھا۔ ہر شے پر جمود طاری تھا آسیہ باجی وغیرہ نہایت مخلص اور آئیڈیل پڑوسی تھے۔ ایسے انسان جو دوسروں کو اپنے سامنے شرمندہ ہوتا دیکھ کر خود کو زمین گڑتا محسوس کرتے ہیں۔ اپنے دکھ کی طرح دوسروں کے معاملے میں بھی اتنے ہی حساس ہوتے ہیں۔

اس روز دوپہر کا کھانا کھا کر وہ ماموں کی طرف چلی آئی جیسے ہمیشہ آجاتی تھی۔ دوپٹہ اٹھا کر۔

بھابھی میکے گئی ہوئی تھی ممانی جان اپنے کمرے میں تھیں راضیہ سے چھوٹی تیرہ سالہ نازو کھولتے پانی سے کچن کا سنک صاف کر رہی تھی۔

"ارے نازو! دوپہر میں صفائی ہو رہی ہے؟۔"

"بس اپیا.... چکنائی جم گئی تھی۔ سوچا ساتھ ساتھ صاف کرلوں.... تاکہ مزے سے سوؤں آپ کو پتا ہے میں دوپہر میں سونے کی کس قدر شوقین ہوں' سب کام ہو جائیں تو نیند اچھی آتی ہے....۔"

"اور مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ سوچا تھوڑی دیر باتیں کریں گے پھر سو جائیں گے' چلو تم جب تک سنک صاف کرو میں کوئی کتاب دیکھ لیتی ہوں۔"

ذرا دیر باتیں ہوئیں منٹوں بعد ہی دونوں صوفوں پر بے سدھ ہو چکی تھیں۔ ڈرائننگ روم میں ہی۔

شام پانچ بجے اس کی آنکھ خود بخود کھل گئی نازو پہلے اٹھ چکی تھی۔ وہ موجود نہیں تھی۔

"اف توبہ! کتنی دیر ہو گئی امی بھی کہہ رہی ہوں گی یہاں آکر یہیں کی ہو جاتی ہوں۔" وہ سوئے سوئے انداز میں دروازے کی سمت بڑھی۔ اسی دم کوئی پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھہر گئے۔

اس نے نیند سے بوجھل ہر تاثر سے خالی آنکھیں اٹھائیں۔ ہارون اپنی بے ساختہ مسکراہٹ سے موجود تھا۔

"راستہ دیں پلیز!۔" جذبات سے عاری لہجے میں اس نے گویا درخواست کی تھی

"میں کیا راستہ دوں؟ راستے تو ہیں ہی آپ کے ہمت کیجئے۔" وہ اس کے سرد انداز پر بھی گویا ندا

ہو کر بولا۔

وہی دھیما لہجہ جس لہجے میں اس نے کئی بار اڑتے اڑتے بول پھینکے تھے۔

اس کا خمار ایک دم اتر گیا۔

"ڈائیلاگ اچھے بول لیتے ہیں آپ۔" وہ تنک کر بولی تھی۔

"آپ کو پسند آئے زہے نصیب۔"

"ارے بھئی! تم دروازے میں کیوں ٹک گئے.... مزہ تو آج ہے کھیل کا آج کل ویسے بھی تم ہار رہے ہو.....۔" اس کی پشت سے آصف بھائی کی آواز آئی۔

"ٹھیک کہا یار تم نے" وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے اسے بغور دیکھ کر بولا۔

ساتھ ہی وہ بھی ایک طرف ہٹ گئی۔ آصف بھائی کو راستہ دینے کے خیال سے جو بساط اور مہروں کا ڈبہ اٹھائے کھڑے تھے۔

"آداب....!۔"

"خوش رہو.... سو رہی تھیں....؟۔"

"جی....! اس نے جیسے گناہ کا اقرار کیا اور باہر نکل آئی دیوانہ.... سمجھتا ہے میں بے وقوف لڑکیوں کی طرح اس کی باتوں میں آجاؤں گی۔ ان مردوں کا ہارون کی لوفرانہ باتیں یاد کر کے دماغ میں کوفت سی بھر گئی۔"

......*

"اپیا.... اپیا....!۔" نازو جانے کہاں سے آوازیں دے رہی تھی۔ "ارے آپ یہاں ہیں.... میں نیچے تلاش کر رہی تھی! یہ ہارون بھائی نے کیسٹ دی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے آپ نے غزلوں کی کیسٹ کے لئے کہا تھا"

"ہم.... میں.... نے.... اوہ.... ہاں اچھا....! لاؤ...." اس نے اس کے ہاتھ سے کیسٹ جھپٹ لی۔

"تم آج اسکول نہیں گئیں؟۔"

"نہیں....!۔"

"کیوں....؟۔"

"ایسے ہی....۔"

"بھئی ریگولر جایا کرو۔"

"پتا ہے اپیا رات کو پاپا کے دوست آگئے تھے۔ دیر سے سوئی تھی ناں پاپا کے دوستوں کے کام میرے ذمہ ہیں۔ ہر دو منٹ بعد چائے کافی' باجی کے سارے کام اب مجھے ہی کرنے پڑتے ہیں۔" نازو بہن کا ذکر کرتے ہوئے بے تحاشہ اداس ہوگئی تھی۔

"بھابھی آگئیں؟۔"

"نہیں کل آئیں گی۔"

"اپیا.... امی کہہ رہی تھیں آپ کی کام والی آئے' تو ہماری طرف بھیج دیجئے گا.... ہماری کام پتا نہیں کیوں نہیں آرہی۔"

یہ کہہ کر وہ واپس چلی گئی۔

"عجیب احمق آدمی ہے.... نازو نویں جماعت میں پڑھتی ہے کوئی ذرا سی بچی تو نہیں جانے کیا کی ہے کیسٹ؟ اس نے دروازہ بند کرکے کیسٹ لگائی۔"

تھوڑی خاموشی کے بعد رفیع کی لچکتی آواز ابھری۔

اے کاش کہ ہوتی خبر تو نے ٹھکرایا ہے
شیشہ نہیں ساغر نہیں مندر سا اک دل ڈھایا ہے

بار بار اسی شعر کی گردان تھی۔ یہی دو مصرے بار بار دہرائے گئے تھے۔ بڑا خوبصورت تسلسل تھا رہا تھا۔ اس نے کیسٹ پلٹ کر لگائی۔ ہارون کی اپنی آواز تھی۔

"صرف ایک بار اعتبار کرکے دیکھو سجیلا عباس....! عورت تو قدرت کی بڑی نازک کاوش ہے یہ اتنی کٹھور کیوں ہوتی ہے۔ سنو یہ مذاق نہیں' کیا واقعی تم اتنی بے حس ہو۔ تمہیں اعتبار دلانے کی کیا قیمت ہے میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔ کچھ خوف خدا کرو۔ وہ نظر پیدا کرو جو یہ کہہ کہ کسوٹی ہو

ہے۔"

تب اس نے کیسٹ نکال لی۔ کچھ دیر غصے سے تھرتھراتی رہی۔

"اف اتنی جرات....؟۔ اس قدر ہمت؟" دل چاہتا ہے موصوف کی والدہ کے پاس لے جاؤں اور کہوں سنبھالیں موصوف کو۔ بڑے پر نکل رہے ہیں۔ غضب خدا کا.... بظاہر اتنا ڈیسنٹ انسان حرکتیں کاؤ بوائے جیسی.... دماغ ٹھکانے لگادوں گی.... میاں مجنوں کا موقع ملتے ہی اس کے منہ پر دے ماروں گی۔ دن میں دو مرتبہ تو اس کے گھر کے سامنے سے گزر ہوتا ہے۔

شام کو وہ امی کو کہہ کر کہ وہ ماموں کے ہاں جارہی ہے۔ مغرب کی نماز کے بعد آجائے گی۔ باہر آئی تو دیکھا' ہارون اپنے گھر کے لان میں کھڑا ٹیوب سے پانی پودوں میں ڈال رہا تھا۔ وہ دوبارہ اندر گئی۔ کیسٹ کی ریل جو اس نے نوچ کر ایک لفافے میں بھردی تھی لے کر دوبارہ آئی' اس نے سبز باڑ سے باہر ہی کھڑے ہو کر کہا۔

"مسٹر ہارون۔"

ہارون نے بے تحاشا چونک کر اپنا جھکا سر اٹھایا۔

اسے دیکھ کر ایک سیراب سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر در آئی' مگر قدم بڑھاتے ہی کوئی چیز اڑ کر اس کے قدموں میں آرہی۔ اس نے جھک کر لفافہ اٹھایا۔ اس کے اندر جھانک کر دیکھا۔ چہرے پر سایہ لہرا گیا۔ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ ٹیوب گھاس پر پھینک کر سینے پر ہاتھ لپیٹ کر سامنے دیکھنے لگا۔ جہاں سانس بھرتا پتھر جارہا تھا۔

"سجیلا عباس.... میں نے تمہاری آرزو کی ہے.... تمہیں اپنے دل میں بہت اونچا مقام دیا ہے.... یہ کام مجھ سے روز تو نہ ہوں گے.... تم اور صرف تم.... مجھے یقین ہے میرے جذبے تمہیں ہرا دیں گے۔ مگر میں تمہیں کبھی شرمندہ نہیں کروں گا" اس نے خوش امیدی کے ساتھ نئے سرے سے اپنی ہمت بندھائی۔

امی کی عادت ویسے ہی جلد گھل مل جانے والی تھی بہت ملنسار عادت تھی۔ اور اب تو یہاں آباد ہوئے بھی سال بھر سے زائد ہوگیا تھا۔ ہارون کی امی سے ان کی گاڑی چھننے لگی تھی۔ ہارون کی

بہنیں اکثر آجاتی تھیں مگر اس کی دوستی خاص طور پر نمبر تین یعنی سعدیہ سے تھی۔ اس کی بہت بنتی تھی۔ سعدیہ حد سے زیادہ لاپرواہ و سادہ تھی سجیلا کو اس کا لاابالی پن بہت پسند تھا۔

کبھی کبھی وہ ضد کر کے گھر لے آتی تھی۔ اور اسے دیکھ کر ہارون کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔ اس کی فقرہ بازی پر وہ نروس سی ہو جاتی تھی۔ اسے متوجہ کرنے کو اس کا شوخی سے کھنکارنا اسے ہراساں کر دیتا تھا۔

"اف! اس شخص کو تو ذرا بھی کسی کی پرواہ نہیں' اب یہ سب لوگ آنکھ کان سے تو پٹ ہیں نہیں۔ یہ شخص تو مجھے رسوا کر کے چھوڑے گا.... خدا معلوم یہ مشرقی مرد کیا ہوتے جا رہے ہیں.... فلمی ہیرو کی طرح.... ہاں۔" چاہتے ہیں بطور مشغلہ دوستی چاہتے ہیں۔.... ہاں چاہتے ہیں.... اقرار چاہتے ہیں.... ان کے جذبے سچے نہیں ہوتے کہ انہیں خود پر اعتماد نہیں ہوتا.... تم جسے چاہتے ہو مشرقی دستور کے مطابق اسے پانے کی کوشش کرو' یہ کیا کہ ایک اقرار کی خاطر مرے جا رہے ہیں مٹے جا رہے ہیں۔ جیسے ان مردوں کی رمق بھر شخصی پہچان نہیں۔

"سجیلا بڑی ایماندار لڑکی ہے.... سنو دیوانے اگر وہ ایک بار تمہارے سامنے بکھر گئی ناں.... تو بہت برا ہوگا کہ تمہاری نہ ہو سکی تو حیات تیاگ دے گی' لیکن کسی دوسرے سے منافقت نہ کر پائے گی.... سجیلا میں دہرے پن کا حوصلہ کہاں۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ ایک بار انکار ہو.... انسان تو کئی بار کمر باندھ کر سکتا ہے.... ہے ناں.... جو ایک بار میں ہمت ہار دیتے ہیں وہ.... ریا کار ہوتے ہیں.... یہ محبتوں کے عارضی کھیل.... اب اتنی بھی بے قیمت نہیں سجیلا.....!۔"

اس نے کروٹ بدلی تو خوف کی ایک لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ وہ بری طرح سہم گئی' آج سجیلا خود پر عیاں ہو گئی تھی۔ خود سے منہ چھپا کر کہاں جاتی؟ وہ سسک پڑی۔

"اگر تم سچے ہو تو وقت تمہارا ساتھی اور سجیلا قدر دان ہوگی۔ وقت تمہیں معتبر کر دے گا تو سجیلا بھی خود کو ہار دے گی۔ مگر اس وقت جب زمانے کی نگاہ میں وہ تمہاری ہو رہی ہوگی۔" اس نے پہلو بدلا تو خود اپنی نگاہ میں رسوا ہو کر سوچنے لگی۔

"بس سجیلا یہی تھا تمہارا کردار.... اب ہارنے کو رہ ہی کیا گیا ہے.... کل یہ دل کیا کہتا تھا آج کیا کہہ رہا ہے؟ کیا کسی اور کے لئے بھی یہ دل یہی کہہ سکے گا.... نہیں.... نہیں.... اللہ توبہ.... کبھی بھی نہیں کون کہتا ہے.... مرد پر عورت کا جادو چلتا ہے.... جادوگر تو یہ لوگ ہوتے ہیں راضیہ! تو نے جانے کب یہ کہا تھا جانے کس بڑے آدمی کی بات کہی تھی کہ عورت اپنے پہلے جذبے میں اپنے چاہنے والے کو چاہتی ہے.... مگر راضیہ.... واقعی میں ٹھوس کردار کی لڑکی ہوں۔ مجھے اپنے فرائض کا احساس ہے' لڑکی اپنا بر خود ڈھونڈھے یہ بات آج بھی ہمارے خاندان میں معیوب نہ سہی ناپسند ضرور سمجھی جاتی ہے۔ اور پھر چادر جتنی اجلی ہوتی ہے داغ اتنا ہی نمایاں ہوتا ہے.... مگر نہیں یہ بھی درست ہے واقعی میرا ماضی.... اجلا کورا ہے.... سنو مہربان.... اپنے لئے سوچنا صرف اپنے مفاد کے لئے سوچنا خود غرضی ہے سجیلا خود غرض نہیں مجھے اپنوں کے سر جھکانا منظور نہیں' وہ بہت دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ اس کا بہت کچھ کھو گیا تھا اور اس میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ اتنا بڑا نقصان برداشت کر سکتی۔"

آج سعدیہ اسے زبردستی لے آئی تھی۔ آسیہ باجی کی شادی ہونے والی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھیں۔ نازیہ یونیورسٹی گئی ہوئی تھی۔

"میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ سوچا آپ کو لے آؤں کیرم کھیلیں گے۔"

"اچھا پہلے میں کچھ پینے کے لئے لے آؤں.... بس ابھی آئی"

اور وہ بے ساختہ سامنے تپائی کی جانب بڑھ گئی۔ جس پر منیر نیازی کی دو کتابیں (مجموعہ) "ماہ منیر" اور "اس بے وفا کا شہر" رکھیں تھیں۔

سعدیہ واپس آئی تو وہ وفور شوق سے بولی "ارے سعدیہ" یہ منیر نیازی کون پڑھتا ہے؟

"ہارون بھائی اور آسیہ باجی کو کریز ہے شعری ادب کا اور ہارون بھائی تو منیر نیازی کے دیوانے ہیں۔ منیر کی کوئی کتاب بازار میں آئے اور ہمارے گھر میں نہ آجائے فوراً" ایسا کبھی نہیں ہوا.... بھئی مجھے تو کوئی دل چسپی نہیں اس شعر و شاعری سے.... ویسے ہارون بھائی دو شاعروں کو خاص طور پر پڑھتے ہیں۔ ایک تو منیر نیازی دوسرے ساغر صدیقی اور آسیہ باجی کشور ناہید اور فراز کو۔"

"آپ پڑھتی ہیں تو لے جایئے گا....۔" سعدیہ نے اس کی جانب گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے اپیا.... آپ کبھی خود بھی آجایا کریں۔ ہمارے گھر آسیہ باجی کہہ رہی تھیں کہ سجیلہ ملنا پسند نہیں کرتی۔"

"نہیں سعدیہ! ایسی تو کوئی بات نہیں بس ادھر قدم ہی نہیں اٹھتے۔"

"کیوں کیا جنوں کا بسیرا ہے یہاں؟۔" اچانک ہارون اندر داخل ہوتے ہوئے بولا

"شاید....! اس نے اپنا لہجہ تیکھا کرلیا۔"

"اور کیا حال ہیں۔؟' میرا مطلب ہے مزاج بخیر؟"

"الحمد للہ....!۔" اس نے کتابیں واپس رکھتے ہوئے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

"اگر آپ پڑھنا چاہیں لے لیں کوئی بات نہیں.... واقعی اچھا بلکہ لاجواب کہتا ہے۔" شکریہ

"اتنی سی بات پر شکریہ.... ہم تو.... ارے بھئی سعدیہ چائے وائے لاؤ ناں.... یہ تو بڑے مہمان ہیں۔"

"ہم تو ابھی ابھی اسکوائش پی کر بیٹھے ہیں۔ یہ گلاس گواہ ہیں۔" شاید اس نے بھائی کے مذاق کیا"

"اچھا میرے لئے کافی لاؤ.... کریم اچھی طرح پھینٹنا۔"

اسے جاننے میں دیر نہ لگی کہ اس نے بہن کو ٹالا ہے۔

"آپ کو یہ شاعر کیوں پسند ہیں' یہ تو کسی بے وفا کا ستایا ہوا ہے۔ بڑے چوٹ کھائے احساسات مالک' آپ پر بھلا کیا اثر ہوتا ہوگا۔ شاعری کا' شاعری سے خط اٹھانے کے لئے تو بڑا' رقیق' حساس اور گہرا دل چاہیے ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں؟۔"

"جی نہیں.... میرے متعلق آپ کے سب اندازے غلط ہیں۔"

"جی نہیں.... سو فیصد درست ہیں۔"

"دراصل میں مرد کو قابل اعتبار نہیں سمجھتی۔ لڑکیوں کی کمی تو نہیں ایک سے ناامید ہو دوسری جانب بڑھ جاتا ہے۔ کسی ایک کے لئے سچا ہو ہی نہیں سکتا.... یہ میری سوچ ہے آپا

میں.... ہارون صاحب! میں آپ سے صاف صاف کہہ رہی ہوں آج آئندہ میرے ساتھ اس قسم کی گفتگو سے پرہیز کیجئے گا۔ میں تنگ آگئی ہوں آپ کی ان سستی باتوں سے باتیں یقین کا معیار نہیں۔ اعتبار کی کسوٹی نہیں۔ میں آپ بڑی عزت کرتی ہوں پلیز....۔"

وہ پھٹ پڑی "ہاں نہیں تو آر یا پار' فیصلہ تو ہونا چاہیے" وہ دم بخود رہ گیا۔ اسے اس طرح برستے دیکھ کر' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بہت کچھ کہہ گئی تھی۔

"کاش سجیلہ! آپ کو احساس ہوتا کس قدر غلط سوچ ہے' آپ کی میرے متعلق یہ بھی سن لیجئے عزت و وقار عورت ہی کی میراث نہیں۔ اس خزانے پر مرد کا برابر کا حصہ ہے۔ مرد کی بھی عزت نفس ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

"وہ خود جیسے لحد میں اتر گئی.... دل مرسا گیا۔"

جیسے وہ آج واقعی کھو گیا۔ اس کا پروانہ چاہت بھی تو دولت ہوتی ہے۔ دولت لٹ جائے تو صدمہ تو ہوتا ہے' اور وہ دامن جھاڑ کر چلی آئی۔

مگر چند گھنٹوں کی پشیمانی کے بعد دماغ میں وہی خناس بھر گیا۔ شاید یہ بھی مرد کا کوئی گر ہو' شاید وہ بن رہا ہو۔ دراصل اسکے گرد کئی مثالیں تھیں۔ جنہوں نے منہ کے بل گر کر چوٹ کھائی تھی۔ اور وہ اسی وجہ سے محتاط رہی آج تک' اور خود کو حق پر سمجھتی رہی اور پھر وہ ایک نہایت مشرقی لڑکی تھی۔ ہارون تھا کہ صرف ایک ہاں کی خاطر کتنی بار ذلیل ہوا تھا۔

"ہر جگہ تماشا بنا دیتا ہے مجھے' میں نے ٹھیک کہا ہے۔"

وہ خود کو تسلی دیتی ہوئی کام میں مصروف ہوگئی' مگر دل کی چبھن کسی طور پر کم نہ ہوئی کئی مرتبہ جی چاہا اس سوگوار کے دامن میں منہ چھپا کر ڈھیروں آنسو بہائے' معافی مانگ لے۔ ہائے حساس لوگ کتنے کم بخت ہوتے ہیں کسی کا دل دکھا کر کسی طور چین نہیں پاتے۔

......*

شام کو سعدیہ کتابیں اٹھائے چلی آئی۔

"ہارون بھائی کہنے لگے کہ تمہاری اپیا نے کہا تھا ان کتابوں کے لئے جاؤ دے آؤ آپ شاید بھول

آئی تھیں۔" اس نے سائیڈ ٹیبل پر کتابیں رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ سب منیر نیازی کی ہیں۔" وہ مزید بولی۔

ہارون نے کہا ان کتابوں کے لئے اس کی استقامت آج بھی وہی ہے گویا" اس کے دل سے ایک بوجھ اتر گیا۔

رات کو سونے سے پہلے وہ ساری کتابیں سامنے پھیلا کر بیٹھ گئی۔ ایک پتلی سی کتاب "آغاز زمستاں میں دوبارہ" اٹھائی اور ورق گردانی کرنے لگی۔ اچانک ٹھٹھک گئی چند اشعار ٹک مارکے ہوئے تھے وہ نظریں دوڑانے لگی۔

میں محبت اس سے کس طرح کروں
دل میں جو ہے کس طرح اس سے کہوں
میرے اس کے درمیان بیگانگی برسوں کی ہے
ایک بے مفہوم خاموشی برسوں کی ہے

وہ سوچتی رہ گئی۔ تمام کتابیں ایک طرف کرکے لیٹ گئی' پھر اس سے کچھ پڑھا نہ گیا۔ ٹیبل لیمپ بجھا کر اس نے بہت کچھ سوچا پاگلوں کی طرح سوچا۔

......*

وہ اپنی اس وضع پر ڈٹی رہی۔ نہ ٹوٹی نہ جھکی نہ مہربان ہوئی' یہاں تک کہ آسیہ باجی بھی پی کے دیس سدھار گئیں۔ گولڈن سوٹ' گولڈن سینڈل' گولڈن نازک سا جڑاؤ سیٹ پہنے اپنے مخصوص انداز میں سینے پر دو چوٹیاں ڈالے وہ کسی کام سے برآمدے کی طرف نکل آئی تھی اس نے تصور میں اپنی حقیقت میں پرائی بے مہر لڑکی کو دیکھا۔ ٹھٹھک کر دیکھا حسرت سے دیکھا اسی دم کہیں سے دوڑتا ہوا جگنو آگیا تھا۔

ہارون اسے گود میں اٹھا کر بولا "یار! تم پر یہ دو چوٹیاں کس قدر خوبصورت لگتی ہیں آج تو تم کسی ریاست کے شہزادے لگ رہے ہو واہ یار! واہ! رات جو دو گھنٹے کی نیند لے لیا کرتے تھے آج سے" بھی گئی" اور اس روز سچ مچ وہ بڑی مشکل سے مسکراہٹ ضبط کر سکی تھی۔

آسیہ باجی کی شادی کے مہینے بھر بعد ہی سعدیہ ایک روز بولی "ہارون بھائی سنگاپور جا رہے ہیں۔ انہیں وہاں نہایت معقول ملازمت مل گئی ہے" پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کاش! آپ انکار نہ کرتیں' ورنہ ہم سب کی یہی تمنا تھی کہ آپ ہماری بھابی بن جائیں خیر نصیب اپنا اپنا" اور اسے جیسے کرنٹ لگ گیا "انکار.....؟"

"کیسا انکار....؟۔"

وہ سن بیٹھی سوچتی رہ گئی۔ یہ سعدیہ کیا کہہ گئی ہے۔

اسی دن شام کو وہ ماموں کے ہاں جگنو کو نہلا کر کپڑے پہنا رہی تھی۔ بھابی یکدم بولیں۔

"سجو! ہر بات کی وجہ ہوتی ہے۔ یہ بلاوجہ انکار اپنی سمجھ میں نہیں آیا۔ بھلا کیا برائی ہے ہارون میں....؟ بلکہ پورا گھر ہی ان کا اچھا ہے۔"

وہ ٹکر ٹکر بھابی کی صورت دیکھتی رہ گئی۔

"سچی بات تو یہ ہے مجھے تمہارے فیصلے سے دکھ ہوا بہت زیادہ پھوپھی امی کہہ رہی تھیں کہ تمہیں ہارون شروع سے ہی ناپسند ہے.... بلکہ پہلے تو تم ان کے ہاں جانا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ مگر سعدیہ زبردستی لے جاتی ہے۔ ان کا یہ کہنا بھی ٹھیک ہے کہ شادی کے معاملے میں لڑکیوں کی رائے کو مقدم رکھنا چاہیے تاکہ شادی کے بعد وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے نبھا سکیں۔ مگر بی بی! جب اتنا اچھا شخص تمہیں پسند نہیں آیا جانے تمہارے خیالات کتنے اونچے ہوں گے کیسا شخص پسند کرو گی؟" "مگر بی بی ذرا اڑان نیچی ہی رکھو کہ جتنے اوپر سے گرو گی میرے منہ میں خاک اتنی زیادہ گہری چوٹ لگے گی۔"

بھابی اپنی ہی کہے جا رہی تھیں۔ دوپہر سعدیہ دھماکے کر گئی تھی۔ اب بھابی کان میں توپیں داغ رہی تھیں۔ اس کی کائنات لٹ رہی تھی۔ بلکہ لٹ گئی تھی۔ کتنے آرام سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا کسے کہتے ہیں۔ آج سمجھ میں آیا تھا۔ ان دنوں وہ راضیہ کی وجہ سے ویسے ہی آؤٹ رہتی تھی۔ اس پر امی کا بار بار کہنا آسیہ کتنا بلاتی ہے۔ چلی جایا کرو بچیوں کے پاس۔ تب ایک روز اس نے جھلا کر کہہ دیا تھا۔

"میرا دل نہیں چاہتا ان کے جانے کو' خاص طور پر ان کے بھائی ہارون تو زہر لگتے ہیں مجھے بس امی آپ مجھے وہاں جانے کو مت کہا کریں۔" اس کے گمان میں بھی نہ تھا اس وقت کی کہی گئی ایک بے معنی سے بات مستقبل میں اتنی اہم صورت اختیار کر جائے گی۔ جب ہی تو امی نے بالا ہی بالا انکار کر دیا تھا۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی ذرا ذرا سی بات اور پسند و ناپسند کو وہ بہت اہمیت دیتی تھیں

اپنا ہی بچھایا ہوا کانٹا تھا جو چبھا تھا۔ آگ اپنے ہاتھوں ہی لگائی تھی۔

اس رات آنسو روکے وہ کس قدر بے کل پھری۔

تڑپتی رہی۔

ایک روز وہ چلا بھی گیا' قریبی پڑوسی ہونے کے ناتے وہ ملنے آیا۔ مگر وہ سامنے نہ آئی سارا کشٹ ضائع جانے کا خطرہ تھا' بہت سے لوگ ایئرپورٹ جا رہے تھے۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا' اس کی جھلک دکھائی دی کلیجے میں برچھی سی لگی۔ گہرے سوٹ میں ملبوس مضبوط سراپے نے سہارا نہ دیا۔ سہارے کی امید تو دی تھی۔ اس شخص نے اتنا ٹوٹ کر چاہا مجھے' آہ کتنا بکھر رہا ہو گا آج جی چاہتا ہے اسے روک لوں۔ اتنا روؤں کہ آنسوؤں کے سمندر میں ماضی سارا کا سارا بہہ جائے۔ مقدر لوگوں کو کھلونا بناتا ہے۔ اس نے مقدر کو کھلونا بنا دیا تھا۔

جانے کیا ہو گیا پھر آنکھوں سے آنسو بہنا ہی بند ہو گئے۔

بے حس سی ہو کر رہ گئی۔

اس کے جانے کے بعد اس نے ایم۔ ایس۔ سی میں ایڈمیشن لے لیا۔ امی کو اس کی شادی کی پڑی تھی۔ انہوں نے اسے منع کیا مگر وہ اب بہت خود سر ہو گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد پہلی عید آئی تو عین عید کے روز اسے عید کارڈ موصول ہوا لفافے پر بڑے آرٹسٹک انداز میں "مجیلہ عباس" لکھا ہوا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا دو سطریں انگریزی میں تحریر تھیں۔

نیچے ایک شعر درج تھا۔

آواز دے کر دیکھ لو شاید مل ہی جائے
ورنہ تمام عمر کا سفر رائیگاں تو ہے

وہ اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ سوجی آنکھیں چھپانے کے لئے اسے سر درد کا بہانہ کر کے بستر پر عید گزارنی پڑی۔ بار ہا تکیے کے نیچے سے کارڈ نکال نکال کر پڑھا اور پڑھ پڑھ کر روئی' احساس زیاں وبال جان بن رہا تھا "اے میرے حبیب جو مقدر محرم سانہ ہوتا تاہم یہ عید مل کر گزار رہے ہوتے اے خدا مجھے صبر کیونکر آئے گا؟ میں سکون کیوں کر پاؤں گی سکون سے نماز پڑھنے کے بعد جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہوں تو ہتھیلی پر تم آ جاتے ہو' مجھ میں تھوڑی سی ہمت ہو تو تمہیں بلا بھیجوں مگر پھر وہی ان کی باتیں بس میرا علاج مرگ ہی ہے ہاں.... شاید

......*

ادھر گھر والے سخت پریشان تھے ایک سے ایک رشتہ آ رہا تھا۔ مگر اس کا جواب یہی' یہ بھی نہیں' وہ بھی نہیں' نہیں' نہیں' نہیں

تب ماں جھنجھلا گئیں۔ "تم آخر چاہتی کیا ہو' تمہارے فائنل میں سال بھر تو رہ گیا ہے شادی میں سال تو لگ جائے گا۔ رشتہ طے ہو جائے تو اور بھی دوسرے بکھیڑے ہوتے ہیں۔ بس اب ہمیں جو پسند آ جائے گا طے کر دیں گے۔ یہ بھی کوئی بات ہے' عمر گزر جائے تو رنڈوے دوہا جو ہی مقدر میں رہ جاتے ہیں۔

"امی! میں سرے سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتی۔"

وہ بول اٹھی (اف کیسے حوصلے دے گیا تھا وہ شخص)۔

ماں ہکا بکا کھڑی رہ گئیں

"کیا بک رہی ہو؟" دماغ تو ٹھکانے ہے....؟"

"بس مجھے مرد کی حاکمیت پسند نہیں' مجھے نفرت ہے شادی سے۔"

"اے بادشاہ زادیاں' ولیوں کی بیٹیاں سب بیاہی گئیں۔ مرد کو تو خدا نے عورت کا ساتھی' اس کا محافظ بنایا ہے۔"

"اب تم۔۔ زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں'.... ابھی تمہیں عقل نہیں ہم جو کریں گے تمہاری

بہتری کے لئے کریں گے سمجھیں؟۔"

تب وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کا تڑپنا ماں سے نہ دیکھا گیا۔ ایک دم نرم پڑ گئیں۔ انہوں نے ٹٹولتی نظروں سے بیٹی کو دیکھا پھر اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولیں "اگر کوئی بات ہے تو ماں سے کہہ دو' ان کی آنکھوں میں اندیشے سرسرا رہے تھے۔ انہیں راضیہ یاد آ گئی۔

"کیا تم کہیں اور چاہتی ہو؟۔"

"ہائیں۔۔۔۔" وہ دھک سے رہ گئی "یہ بات ماں کے ذہن میں کیوں آئی۔۔۔۔؟"

"نہیں امی۔۔۔۔ میں کبھی بھی نہیں۔۔۔۔"

"کبھی نہیں کا کوئی سوال نہیں۔۔۔۔ اگر تم ابھی تیار نہیں تو دو سال بعد سہی چلو یہ رونا دھونا بند کرو۔۔۔۔" وہ باہر نکل گئیں۔

تب اس نے سوچا ہاں شاید وہ اس عرصے میں واپس آ جائے تڑپ کر' پھر جب لوگوں کی زبانی اسے معلوم ہوگا کہ وہ مسلسل شادی سے انکار کر رہی ہے۔ پھر شاید وہ آپ ہی آپ سمجھ جائے مجھے بے رحم کہنے والا۔ کس قدر بے رحم و سنگدل ہے کیسے جذبے جگا گیا۔ نہ مردوں میں چھوڑ گیا نہ زندوں میں' اس کو تو احساس بھی نہیں ہوگا کہ وہ کس قدر تباہ کر گیا ہے۔ کسی کی ہنستی کھیلتی زندگی کو۔ مگر وہ تو ایک مرتبہ کے انکار سے حوصلہ ہار گیا ہے مگر نہیں وہ واقعی دکھی ہو گیا ہوگا کہ ہمارے گھر والوں نے نہیں بلکہ میں نے خود' اس کا دل چاہا آپ اپنا آپ پیٹ ڈالے۔ چیخیں مار مار کر روئے۔ کئی بار قلم اٹھا کر تڑپ کر بیٹھی۔ چاہا صرف اتنا لکھ دے "آ جاؤ"

اسی دم ذہن کے کسی کونے میں راضیہ سرسراتی استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ "بجو جان محبت نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔۔۔۔ اب معلوم ہوا۔۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ میں محبت تو نہیں کرتی۔۔۔۔ اس کی شدتیں دیکھ کر میرا دل۔۔۔ میرا نرم دل مجھے ملامت کرتا رہتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کوئی اور بھی تو ہوگا جو اتنی استقامت سے میرے ٹھکرانے کا مقابلہ کرتا رہا ہے۔ واقعی میں اپنی نرم دلی سے مجبور ہوں مجھے محبت تو نہیں۔۔۔۔ مجھے نزلہ۔۔۔۔ زکام

فلو۔۔۔ ہو سکتا ہے۔ مگر محبت ناممکن۔۔۔۔ قطعی نہیں۔۔۔۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا ہے کہ میں نے ایک حساس شخص کا دل دکھایا ہے میں ہمیشہ خود احتسابی کے عمل میں مصروف رہی ہوں۔ میرا موجودہ طرز عمل انصاف پر مبنی ہے۔"

وہ محبت سے منکر لڑکی طفل تسلیوں میں خود کو بہلاتی رہی آنے والا نہ آیا۔

آسیہ سے چھوٹی نازیہ اسی کے کالج میں لیکچرار تھی۔ دونوں ساتھ جاتی تھیں آج کل میں نازیہ کی شادی بھی ہونے والی تھی۔ صرف ہارون کے انتظار میں اس کی شادی اتنی لیٹ ہو گئی تھی۔۔۔۔ مگر اب اس کا انتظار' تمام تھا۔

کالج جاتے ہوئے نادیہ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بتایا۔

"ہارون بھائی کا رات فون آیا تھا۔ انہوں نے شادی کر لی ہے بہت وہ ہیں' ہم سب سے باتیں کرتے رہے وہ آسیہ باجی نے شادی کا ذکر چھیڑ دیا تو بولے میں نے کر لی ہے ایک ہم وطن لڑکی سے' بہت وہ ہیں' ہارون بھائی' لو بھلا ہمیں بتا دیتے ہم کتنی چاہ سے بیاہ کرلاتے' ہمیں کتنا ارمان تھا ان کی شادی کا۔"

نہ جانے نادیہ کیا کیا کہتی رہی۔ اس کی آنکھیں بے نور اور کان پٹ ہو رہے تھے بے حس و حرکت بیٹھی رہ گئی۔

"ہم نے پوچھا کب آ رہے ہیں۔۔۔۔ بولے کبھی بھی نہیں۔"

نادیہ نے ونڈ اسکرین پر نظریں گاڑ کر مزید اطلاع بہم پہنچائی۔

"ہونہہ۔۔۔۔! آئے گا بھی کس منہ سے۔"

اسے گئے سات برس ہونے کو آئے تھے۔ اس کے ساتھ برس اس کے سات قرن خواہ مخواہ اپنا آپ ملیامیٹ کرتی رہی۔ یہ ہوتی ہے مرد کی محبت' یہ ہوتا ہے اس کا عشق

اندیشے تو میرے مرد کے متعلق روز اول سے ٹھیک تھے حقیقت سے فرار تو میں نے خود چاہا تھا۔

"ہرجائی ایکٹر کہیں کا' گھر آ کر وہ رات بھر کس قدر روئی تھی۔ بے حد و حساب اس کا شادی سے انکار جاری رہا گھر والوں نے سزا کے طور پر اس سے بات چیت تک بند کر دی۔ اس پر کوئی اثر نہ

ہوا' برہی کی ہر بوند گری اور پھسل گئی اور اب آسیہ نادیہ' سعدیہ مامون نازو' سرفراز سب شادی شدہ تھے اپنی اپنی دنیا میں گم' جگنو بیس برس کا خوبصورت جوان تھا' اس سے چھوٹی لبنی اور عظمیٰ بھی جوانی کی جانب قدم بڑھا رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کا گداز ختم ہو چلا تھا۔ چہرہ وقت کی سرد مہری کا آئینہ بن گیا تھا۔"

سوچوں کا انداز بدل گیا تھا۔

چال میں بلا کا اعتماد آ گیا تھا۔

آخر کو وہ سرخرو تھی.... سترہ برس گزرنے پر بھی.... اس نے کوئی دعوے نہ کیا تھا.. مگر کیسی استقامت دکھائی اور جو جھولیاں بھر بھر جھوٹی محبتوں کے اعتراف کرتا تھا کیسا گر گیا تھا.... اپنے ہی بولوں کے آگے شرمندہ تھا.... ہار گیا تھا.... تھک گیا تھا.... ٹوٹ گیا تھا.... وہ اپنے تدریسی پیشے میں گم تھی... یہ سوچ کر.... کبھی تو آؤ گے....

میں تو کچھ بھی نہ بولوں گی.... مگر مجھے دیکھ کر خود اپنی نظروں میں اس قدر گر دو گے کہ منہ چھپانے کو ٹھکانہ نہ مل سکے گا.... نہ ہی مرنے کو جگہ۔

میں نے اپنی عمر کا قیمتی حصہ گنوایا ہے۔

جیسے کندن کو کوئلوں کی دلالی میں دفن کیا ہو۔

ایک عورت جو اپنے شوہر کی محبتوں میں وقت گزارتی ہے۔ اس کی چاہتوں گرم جوشیوں سے آسودہ ہوتی ہے.... اپنے دکھ تکلیف بتاتی ہے.... وہ بھی بڑھاپے کو دہلیز پر کھڑا دیکھ کر کبھی کبھی افسردگی سے سوچتی ضرور ہے۔ کہ کبھی وہ کیا تھی اس وقت کے لطف کیا تھے اور ایک میں.... ازل سے آج تک تہی دامن...."۔

تنہائی کے بھڑکتے الاؤ میں جلی

کسی کے انتظار میں قطرہ قطرہ شمع کی طرح پگھلی۔

کیا میرے سینے میں جذبات نہ تھے....؟

تم نے مجھے برباد کیا ہے.... مجھے پامال کیا ہے۔

مجھے ضائع کیا ہے.... مجھے قتل کیا ہے۔

تم نے مجھے کیوں احساس دلایا کہ تمہاری شدتیں حقیقی ہیں' جب کہ ایسا نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے.... میری غلطی.... میری خطا سہی کہ میں اپنے منہ سے کچھ کیوں نہ پھوٹی.... مگر اے محبتوں کے پیامبر.... اے شدتوں کے دعویدار.... سچے لوگ تو پر امید ہوتے ہیں۔ ایک بار تو آ کر جھانک لیتے.... مگر تم سچے کب تھے؟ اگر تم غصہ کی اداکاری نہ کرتے تو سعیلہ تم پر کیوں اپنا آپ مٹاتی۔"

کس قدر وقت گزر گیا تھا۔ اس نے سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کو دیکھا جو برش مارنے سے چٹخ گیا تھا.... اس نے پشیمان سی نظریں آئینے پر دوڑائیں.... جیسے عموماً "لوگ غصے کا بھوت اترنے پر پشیمان ہوتے ہیں.... پھر کپڑے اٹھا کر باتھ روم میں گھس گئی.... شاور کے نیچے بھیگتے ہوئے اس نے سوچا.... "اے پائے کے اداکار اب مجھ سے اداکاری نہ کرنا میں دیکھوں گی بیوی کے ساتھ کیسے ہو' پھر میں تمہاری ڈپلومیسی کو واقعی سراہوں گی۔ دو عورتوں کو اپنی محبتوں کا یقین دلانا والے ایکٹر.... آج تم اپنی زندگی کا شاہکار ڈرامہ کھیلنا فراز بھی مامون وغیرہ کے ساتھ ایئر پورٹ گیا ہوا تھا وہ باتھ روم سے باہر آئی تو برابر والے گھر کے باہر شور ہو رہا تھا اچھا خاصا.... خوشیوں سے بھرپور قہقہوں کا شور گویا وہ آ گیا تھا.... اس کے پر اعتماد قدم کانپ گئے۔

وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی.... سب لوگ شائد اندر جا چکے تھے۔

"م.... میں.... نہیں جاؤں گی.... میں کیوں جاؤں کیا رشتہ داری ہے؟ اب تو یہیں رہے گا.... کبھی بھی مل لیں گے۔ ملتے رہیں گے.... آخر سترہ برس بھی تو گزرے ہیں' سترہ برس کم نہیں ہوتے۔ لمحہ تو وہی صدیوں پر بھاری گزرتا ہے جو ملن کی تڑپ میں گزرتا ہے.... نایاب.... نارسا.... لمحہ....!"

......*

اسے آئے ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ نادیہ نے تو شادی کے بعد ہی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اب تو وہ تنہا ہی تھی۔ دو دن سے کالج بھی نہیں گئی تھی۔

رات کے نو بج رہے تھے جب فراز کی دلہن ہمانے کمرے میں قدم رکھا۔

"ہارون بھائی آئے ہیں آپ کو یاد کر رہے ہیں۔"

"وہ ساکت سی بیٹھی رہ گئی' اپنی خود اعتمادی کھو بیٹھی۔"

"فراز نہیں ہے؟۔"

"وہ وہیں ہیں'.... ہارون بھائی تو کافی دیر سے آئے ہوئے ہیں امی کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔" (امی آنکھ کے آپریشن سے فارغ ہو کر آج ہی گھر آئی تھیں)۔"

"اچھا تم چلو میں آ رہی ہوں۔"

"وہ میز پر سے سنہری فریم کی عینک اٹھا کر لگاتی ہوئی بولی اور شانوں پر دوپٹہ برابر کرتی اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔"

ڈارک براؤن تھری پیس سوٹ میچنگ ٹائی مع دکتی ٹائی پن' چم چم کرتے جوتے کنپٹیوں پر برابر کئے ہوئے سفید بال سجیلہ نے دروازے پر اس کا جائزہ لے لیا خاموشی سے اندر کی گرتی پڑتی سجیلہ کو سہارا دیئے وہ اندر چلی آئی۔

"السلام علیکم۔" اس نے مخصوص دھیمی آواز میں مہمان کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام....۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا

"تشریف رکھیئے۔" اس نے پروقار انداز میں ہارون کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

"چند بے ثبات لمحے خاموش گزر گئے۔"

"کیا حال ہے آپ کا.... کیا کر رہی ہیں؟۔"

"حال تو پر امن ہے' مقامی کالج میں کیمسٹری پڑھاتی ہوں'۔" وہ خوش خلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"اور آپ....؟۔" وہ.... آپ اپنی بیگم بچوں کو نہیں لائے؟"

"اپیا.... ہارون بھائی نے شادی نہیں کی انہوں نے شادی سے بچنے کے لئے تو یہ جھوٹ بولا ایئرپورٹ پر سب نے سب سے پہلے یہی سوال کیا تھا....۔" فراز ہنسا تو اس ہنسی میں ہارون کی

مسکراہٹ بھی شامل ہو گئی۔

"شادی نہیں کی.... وہ.... گم صم سی رہ گئی۔"

"ہارون بھائی.... یہ جو اپیا ہیں ناں یہ بھی آپ کی طرح تجرد کی زندگی گزار رہی ہیں اب چونکنے کی باری ہارون کی تھی۔"

وہ اپنی جگہ چور سی بن گئی تھی۔

"اچھا' آپ بتائیں آپ نے جھوٹ کیوں بولا تھا کیوں بولا تھا؟۔" فراز نے سوال کیا۔

گھر سے ہر ہفتے کوئی تصویر پہنچ جاتی تھی۔ امی کی ایک رٹ تھی کہ لڑکی پسند کر لو بس یہ سلسلہ روکنے کے لئے جھوٹ بولنا پڑا۔

"آپ نے یہ سلسلہ روکا کیوں؟۔" فراز نے خوش دلی سے استفسار کیا۔

"اس لئے کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"وہ آخر کیوں....؟۔"

"ہارون کی نظر اس کی سمت اٹھی.... ماضی کی دلفریب عمارت کا کھنڈر ابھی غیر واضح نہ ہوا تھا۔"

"چھوڑو یار.... ان باتوں کو.... اپنی سناؤ کیسی گزر رہی ہے.... انہوں نے بات کا رخ موڑ دیا.... اور اس نے رکا ہوا سانس خارج کر دیا۔"

"بالکل خوش و خرم.... خدا کا شکر ہے۔" فراز نے اظہار تشکر کیا۔

"میں ابھی آئی چائے کے لئے کہہ آؤں"

"اپیا! آپ بیٹھیں میں ہما سے کہہ دیتا ہوں۔" وہ احتراماً بولا

آپ فراز کی دلہن سے ملے؟"

"جی ہاں۔"

"پسند آئیں۔"

"بہت۔"

"چند توجہ کناں لمحے اور سرکے۔"

"سجیلہ! آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟۔"

"ایسے ہی۔"

"ایسے ہی تو کوئی جواز نہیں.... مگر میں ایک نتیجے پر پہنچ رہا ہوں کہ آپ کو دراصل مردوں سے الرجی ہے۔"

"ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں.... اچھا یہ بتایئے آپ نے کیوں نہیں کی؟۔"

لمحوں کی خاموشی.... صحرا کے سناٹوں پر بھاری ایک نہایت شکست خوردہ آواز ابھری

"سجیلہ.... عباس.... میں نہیں جانتا کہ ہماری عمریں پرانی باتوں کو دہرانے کی اجازت دیتی ہیں نہیں اب تو وقت نے بھی مجھے معتبر کردیا ہے.... آج آپ نے ہمیشہ سے زیادہ مجھے دکھ دیا ہے۔ اس وقت صرف آپ کی خاطر یہاں حاضر ہوا تھا مجھے معلوم ہوا کہ آپ نے شادی نہیں کی.... تھوڑی خوش فہمی ہوئی مگر آپ کا موجودہ رویہ.... ہمیشہ کی طرح تکلیف دہ ہے.... آپ کی سنگدلی بھی عروج پر ہے۔"

آج انداز میں شوخی لہجے میں کھنک نہیں تھی مگر باتیں وہی تھیں ایسا لگا کہ وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ وہ اس کی باتیں اور اسے نظرانداز کرتی ماموں کے گھر گھس گئی تھی جب واپس ہوئی تو وہ کھڑا تھا۔ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ۔

"آپ نے کیوں عمر ضائع کی....؟۔" اتنی دیر میں وہ اپنی ناتواں انا کو سہارا دیکر کھڑا کر چکی تھی پھر ایک پتھریلی سی بات کہہ دی۔ جو سیدھی اس محروم شخص کے کلیجے میں لگی۔

"جو لمحہ.... کسی یاد میں گزر جائے ضائع نہیں ہوتا....۔" وہ تو اس کے سامنے ہمیشہ سے کھلی کتاب رہا تھا۔ آج بھی اس کے صفحے جلی حروف سے معمور تھے۔ وہ تو ہمیشہ سے اس کے سامنے ہوا تھا جب ہی دل کی باتیں بڑے آرام سے کہہ رہا تھا۔

"عمر تو آپ نے ضائع کی ہے.... سجیلہ عباس.... بے سبب بلاوجہ۔"

"عمر تو میں نے بھی.... دراصل مجھے احساس نہیں کہ میں نے عمر ضائع کی ہے۔"

میں ایسی ہی زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ میں بہت خوش ہوں...." پھر جھوٹ سفید جھوٹ.... اس

من دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"یہ بڑی تاثرشکن و ناقابل یقین بات ہے کہ بلاوجہ .... بڑا جرات مندانہ اقدام ہے.... ویسے....۔"

"معاف کیجئے کون تھا وہ خوش نصیب؟ جس کی وجہ سے میری ذات آپ کی نگاہ میں بے وقعت رہی۔ اور جس نے آپ کو اتنی جراتوں سے نوازا۔"

"کیسی چوٹ....؟ کیسا تاکا ہوا نشانہ.... شک کی گالی یہ رسوائی بھی میرے مقدر میں باقی رہ گئی تھی.... یہ وہ مقام ہوتا ہے جب مرد اپنی تمام خوبیوں سمیت برا لگتا ہے.... شک کی گالی دیتے ہوئے۔"

"میرے مہربان.... وہ خوش نصیب میرا مقدر ہے' میری مغرور انا ہے۔ جس نے پہلے تمہیں دھتکار دیا تھا اور دوبارہ جھکنے کا ظرف اس کے پاس نہیں تھا میرے خوش نصیب مقدر کی وجہ سے ہی میں تہی دست ہوں کہ قسمت سے میری بہن نے روایتوں و قدروں کا ایک مدفن بنایا تھا۔ جب تم نے مجھے بلایا اس وقت اس مدفن کی مٹی گیلی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ گزرگاہ یہی ہے کہیں اس مدفن پر میرے قدموں کے گہرے نشان نہ بن جائیں۔"

میری زندگی میری روح.... واپس لو اپنی یہ گالی.... میں تو آج بھی بڑی معزز ہوں.... یہ تم نے کیا کہہ دیا جیسے بھرے بازار میں آنچل کھینچ لیا ہو۔

تم اب بھی نہیں سمجھے.... تم کبھی بھی نہیں سمجھے.... تم آج بھی نہیں سمجھے.... دراصل" وہ کھنکار کر بولی۔

"میرا دل بہت کمزور رہا ہے بچپن سے ڈاکٹروں کے مطابق میں ازدواجی ذمہ داریاں اٹھانے کی اہل نہیں۔"

"دل کی بیماری کے تو سینکڑوں علاج ہیں ویسے کبھی اس قسم کا تذکرہ نہیں ہوا۔" وہ حیران سے تھے۔

اپنی اولاد کے عیب تو سب چھپاتے ہیں' خاص طور پر بیٹیوں کے۔"

"خیر علاج تو اب بھی ہو سکتا ہے اب آپ لاپرواہی نہ کریں۔" (اگر آج تم میرے ہمراہ ہوتیں تو؟)

"ہاں ہارون اب جب کہ اس وقت بھی میں تمہارے سامنے بڑے عزت دار.... ناک والی بنی بیٹھی ہوں.... اور اب کچھ فائدہ بھی نہیں کچھ کہنے کا.... سو خموشی بہتر ہے.... یہ جھوٹ.... من گھڑت بیماریاں بہتر ہیں۔ اگر تم سترہ برسوں میں ایک مرتبہ بھی آواز دے لیتے تو ہم یہاں نہ ہوتے جاؤ.... ہارون میرا کشٹ ضائع نہ کرو.... اب چادر کو داغ نہ لگاؤ.... یہ ہونٹ جو سرگوشیوں کے عادی بھی نہیں انہیں کیسے بگل بنادوں.... کچھ تو میرے پاس رہے.... سکھ کی دولت نہ سہی.... وقار کی دولت ہی سی.... انا کی کمزور لاٹھی ہی سہی۔"

جاؤ ہارون.... اپنی دنیا میں گم ہو جاؤ.... نامرادی کا احساس کہیں میرا دشمن نہ بن جائے.... کل کی پایاب چیزیں آج بالکل نایاب ہیں

ایک جی دار مرد جو دیر سے پردے کے پیچھے کھڑا تھا بہن کے المیے پر کڑھ کر رہ گیا تھا۔ جو ایک مرد نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ دوسرا مرد سمجھ گیا تھا۔

نولکھا ہار

شہر سے بہت پرے ایک ساحلی علاقے میں یہ مچھیروں کی بستی ہے اس بستی میں بچہ پیٹ ہی سے مچھلی کی باس سے آشنا پیدا ہوتا ہے۔ یہاں رسائی بسائی کا ساز سامان ہے۔ بچے ہیں' جانور ہیں' پرندے ہیں' اور نزدیک ہی فیشن ایبل علاقے کے صاف ستھرے گھروں کی غلاظت کے ڈھیر بھی' یہ وہ ٹھکانا ہے جہاں کارپوریشن کی خالی گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے لئے یہ "علاقہ غیر" ہے جس کا اخباری مراسلوں تک میں بھی کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود بستی کا ہر شخص بے فکر اور خوش باش ہے "لاعلمی ایک نعمت کے مصداق"

کارپوریشن کی مہربانوں نے مصنوعی کوہساروں کی شکل میں اونچے لوگوں اور مچھیروں کے درمیان ایک حد قائم کردی ہے۔ "کوڑا کوہسار" کے اس پار مچھیروں کی جھونپڑیوں کی صرف چھتیں نظر آتی ہیں۔ ہر جھونپڑی میں ٹاٹ کے پردوں کی مدد سے پارٹیشن بنے ہیں گویا "آل ان دن" کا معاملہ ہے۔

نہ جانے کیسے' ادھر بھی ترقی کے ولولے اٹھ کھڑے ہوئے پانچ سات لڑکے عسرت میں اٹے چہروں کے ساتھ کتابیں اٹھائے کسی سرکاری اسکول میں جاتے دکھائی دینے لگے

ستر سوراخوں سے مرصع پردوں کے اس جھونپڑے میں صرف "گیارہ" ارکان ہیں ان گیارہ میں سے ایک نے علم کا بیڑا اٹھایا ہے نو برس کا دین محمد اس سال دوسری چڑھا تھا۔ ذہانت کسی کی میراث نہیں' پڑھنے میں بہت تیز ہے۔ وہ کلاس فیلوز سے کہانیاں کی کتابیں لاتا اور اپنے بہن بھائیوں میں "

کا ناراجہ" بن کر سنایا کرتا ہے مگر کہانیاں سناتے وقت باقاعدہ اداکاری بھی کرتا جاتا ہے۔ آج بھی جب شام ڈھلنے والی تھی' ماں روٹیاں پکارہی تھی۔ بڑی بہن چمپا بکریوں کے آگے سبزی کے چھلکے ڈال رہی تھی تو دین محمد چھوٹے بہن بھائیوں کو کوئی کہانی سنا رہا تھا۔

"شہزادی حسن بانو کا نولکھا ہار کھو گیا' بادشاہ نے چور کا پتا چلانے والے شخص کے لئے بڑے انعام کا اعلان کیا اس ہار میں نو قیمتی پتھر جڑے تھے۔ جو بے حد خوبصورت اور نایاب تھے......"

"دینو' نایاب کسے بولیں؟" چھوٹے بھائی فتح محمد نے استفسار کیا۔

"ابے بول لے یا سن لے۔" دینو جھلایا' ایسی جھلاہٹ جو کسی کمزوری کا پردہ ہوتی ہے اب ا بھی لائق نہیں تھا کہ وہ نایاب کے معنی جانتا۔

بکری کی زنجیر درخت میں کستے ہوئے چمپا نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا "دینو ہار کی فوٹو بھی ا ہے؟"

"ہاں۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"چمپا زنجیر چھوڑ لپک کر آئی "دکھائیو میرے کو۔"

دین محمد نے اکتا کر کتاب کا رنگین سرورق آگے کر دیا۔

"ہائے مولا..... کیسا اچھا ہے یہ ہار....." کھوٹے زیوروں کو ترسنے والی آنکھوں سے رشک حسرت صاف جھلکنے لگی "ہائے سجادیاں (شہزادیاں) کیسے نصیبوں والی ہوویں' ایسے ہار پہنیں اس نے مارے رشک کے تصویر پر ہاتھ پھیرا۔

"اچھا چھوڑ دو۔" دینو نے کتاب چھین لی۔

چمپا وہیں پٹی سے ٹک کر کہانی سننے لگی تو اس کی ماں دہاڑی "ارے اب ہار کے سپنوں میں ٹ روے گی؟ باوا آن والا ہو رہا' کھاٹ بچھادے اس کی"

ماں کی جھاڑ پر وہ اٹھ تو گئی مگر کھوئی کھوئی سی۔

اللہ نے مجھے ساتویں برس بیٹا دیا تھا جب خون پانی ہو چلا تھا اور جان سوکھا پتا میں خوشی پھولے نہ سماتی تھی..... جٹھانی کی دو بیٹیوں پر میرا ایک بیٹا بھاری تھا۔ میرے سسرال کا پہلا پوتا!

یہ جو بیاہ کے بعد میں نے سات برس گزارے تھے درس عبرت ہیں ان کنواریوں کے لئے جو شادی کو خوشیوں کا زینہ سمجھتی ہیں۔ میرے سسرال کا شجرہ نصب نوابوں سے ملتا ہے' آج بھی میرے سسرالیوں میں نوابوں کی خوبو باقی ہے میرا میکہ بھی اپنا ایک معیار رکھتا ہے۔ میں جہیز میں وہ سب کچھ لائی تھی جس کی آرزو کی جاتی ہے۔ بچہ نہ ہونے کی وجہ سے صرف سرد مہریاں اور کٹیلی مسکراہٹیں سہی تھیں' زبان کے گھاؤ سے پور پور بچ رہی تھی اس کی وجہ غالباً "میرا لمبا چوڑا جہیز ہی ہو سکتا ہے۔ یا میرا معزز خاندانی پس منظر یا پھر میری خاموشی' اطاعت گزاری اور ہر دم مصروف رہنے کی عادت' بہرحال اب خوشیاں مجھ پر ٹوٹ کر برسی تھیں میرے شوہر اسد نے مجھے فیروزے کا بہت خوبصورت سیٹ دیا تھا ساس نے پوتے کی پہلی سالگرہ پر اس کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی ڈالی جٹھانی نے نقرئی کام کی شیروانی ٹوپی کرتے کے ساتھ پہنائی' میرا بیٹا اس قدر حسین لگ رہا تھا کہ مجھے دیکھتے ہوئے خوف آرہا تھا' مبادا نظر لگ جائے

سالگرہ کا جشن ختم ہوا' نوکروں کے ساتھ سمیٹا سمٹائی کے بعد جب میں اپنے بیٹے اطہر کے کپڑے بدلنے لگی تو اس کا جسم گرم محسوس ہوا میں پریشان ہو گئی' اور ڈریسنگ روم سے نکلتے اسد کو دیکھ کر تشویش سے کہا "شاید اسے حرارت ہو گئی ہے"

دوسری صبح اسے اچھا خاصا بخار ہو گیا تھا۔ میں اپنے ہنستے ہمکتے بچے کو بستر پر چپ دیکھ کر آبدیدہ سی ہو گئی۔ امی جان اور بھابی جان مجھے دلاسہ دینے لگیں۔ دلہن دکھ بیماری بھی جان کے ساتھ ہیں گھبرایا نہیں کرتے"

پولیو وغیرہ کے ٹیکے تو میں نے شروع میں لگوا لیے تھے۔ اس لئے اس طرف سے کوئی فکر نہ تھی مگر میرا اتنا ہنستا کھیلتا شرارتی سا بچہ کیسا نیم جان سے نظر آنے لگا تھا اسد مجھے تسلیاں دیتے رہتے۔

ہمارا فیملی ڈاکٹر دوا پر دوا بدلنے لگا تو میں دہل کر رہ گئی مگر اس نے مجھے تسلی دی۔ بچے کو میں اپنا دودھ پلاتی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے پرہیزی فوڈ چارٹ بنا کر دیا۔ میں اطہر کے اس مستقل بخار سے سخت ہراساں تھی۔ دس پرہیز ڈاکٹر نے بتائے تو دس میں نے خود کر لئے "دکھیا دیوانہ" کے مصداق اب تو اسد بھی متفکر نظر آنے لگے تھے اور امی جان بھی۔

ڈاکٹر نے ڈبے کا دودھ تجویز کیا مگر اس سے تو اطہر اسہال سے اس قدر بے حال ہوا کہ میں نے روتے ہوئے ڈبا کھڑکی سے باہر اچھال دیا اور رات کو اسد سے بہت لڑی

"بس یہی ڈاکٹر رہ گیا ہے میرے بچے کے لئے' اور بھی تو ہیں بس انہی پر تکیہ کئے رہیں۔"

وہ میری سخت گفتاری کا برا مانے بغیر مجھے اپنے کندھے سے ٹکا کر سمجھانے لگے کہ میں اپنے حواس نہ کھوؤں وہ کل ہی کسی دوسرے مستند معالج سے رجوع کریں گے۔

اگلے روز اسد کے ہمراہ ایک نامی گرامی چائلڈ اسپیشلسٹ کے پاس چلی آئی' اس نے معدے میں گڑبڑ بتائی اور ڈھیروں نسخے حوالے کئے۔ مجھے اپنا دودھ پلانے کی تلقین کی اور صرف سبزیاں استعمال کرنے کی ہدایت بھی کی' میں نئے ولولے سے گھر آئی کچھ افاقہ محسوس ہوا اور اسہال کی شکایت رفع ہوئی تو میں نئے دم خم سے تیمارداری میں جٹ گئی۔

رات بہت عرصے کے بعد مجھے کچھ سکون کی نیند آئی' بھابی کی بچیاں تو آپا کی نگرانی میں ہوئی تھیں۔ مگر مجھے اپنا بچہ آپا کی گود میں دینا گوارا نہ تھا۔ وہ ماں ہی کیا ہوئی جس نے اپنے بچہ کی ہنسی کلکاری اپنی گود میں نہ دیکھی سنی ہو' روتے سسکیاں بھرتے بچے کو سینے سے لگا کر چپ نہ کرایا ہو یہ وہ روحانی رابطے ہیں جو ماں اور بچے کے درمیان خاموشی سے قائم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ درمیان شب میری آنکھ کھلی۔ میں نے ڈبل بیڈ سے کافی فاصلے پر ایک اور بیڈ ڈلوالیا تھا تاکہ ہم دونوں ماں بیٹے کی وجہ سے اسد ڈسٹرب نہ ہوں' میں نے ایک نظر بیٹے پر ڈالنا ضروری سمجھا۔ اس کے منہ سے ہلکا سبز لعاب بہہ رہا تھا اور تنفس بہت تیز تھا۔ میں چیخ پڑی "اسد..... میرا بچہ....."

اسد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور پریشانی سے اطہر کو دیکھنے لگے۔ نئے ڈاکٹر کے تجویز کردہ چند ڈراپر اطہر کے حلق میں ٹپکائے مگر سانس کا عالم وہی رہا امی جان تہجد کے لئے اٹھی ہوں گی' میری چیخ سن کر چلی آئیں میں انہیں دیکھ کر رو پڑی "امی جان..... میرا بچہ اگر اسے کچھ ہو گیا' امی تو' میرا کیا ہو گا..... ؟ میں کہاں جاؤں ؟"

اسد میری سمت پلٹے "اپنے آپ کو سنبھالو زیب' اس طرح ہاتھ پاؤں چھوڑنے سے کیا ہو گا؟"

"اے میرے مولا اسے صحت دے' کتنی دوائیاں کھلائیں کتنی نظریں اتاریں ہیں۔" امی جان

بھی آبدیدہ ہو گئیں۔

تمام رات سولی پر لٹکتے گزر گئی صبح ہوتے ہی ڈاکٹر کی سمت دوڑے اس نے مشینوں کے ذریعے چیک اپ کیا۔ بھاری فیس لی اور مجھے تسلی دی' روپے پیسے کی تو مجھے ذرا پروا نہیں تھی۔ میری تو بس ایک ہی آرزو تھی کہ میرا بچہ پہلے کی طرح ہنسنے کھلکھلانے لگے۔ میں تو بچے کے ساتھ خود بھی بیمار ہو چلی تھی۔ اسد' امی جان' میرے جیٹھ فہد' بھابی جان' میرے دونوں دیور سعد اور احمد مجھے دلاسہ دیتے رہے مگر میں اپنے بچے کو اس قدر ناتواں دیکھ کر بے حد بے قرار تھی۔

ہماری نئی نوکرانی کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔ مجھے روتا دیکھ کر بولی "بی بی ایک بات کہوں' برا نہ مانا' آپ بڑے لوگ ہیں"

"ارے نہیں کہو کیا بات ہے؟" میں جلدی سے اس کی سمت متوجہ ہو کر بولی۔

"بی بی' ہماری طرف ایک حکیم جی ہیں' میں پہلے جس گھر میں کام کرتی تھی' ان کی لڑکی بھی اطہر میاں کی عمر کی تھی۔ اسے بھی معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا۔ انہوں نے بہتیرے علاج پرہیز کئے مگر وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ ایک دن میری اماں انہیں حکیم جی کے پاس لے گئیں' اللہ قسم اب تو ایسی چنگی بھلی ہے ان کی لڑکی کہ کیا بتاؤں' اب تو وہ کویت چلے گئے ہیں۔ آپ کہو تو لے چلوں بی بی؟"

میں تو یہ سب سنتے ہی جذباتی ہو گئی "ہاں آمنہ کب چلیں؟"

"ابھی چلیں جی۔"

"اس وقت دوپہر کے گیارہ بج رہے ہیں تین بجے چلیں گے اور دیکھو گھر میں تذکرہ نہ کرنا۔" میں نے اسے تنبیہہ کی' مبادا گھر کے لوگ کہیں کہ کس کی باتوں میں آ رہی ہو'

آمنہ نے سر ہلا کر گویا حلف وفاداری اٹھایا۔

تین بجے ڈاکٹر کے ہاں کا کہہ کر میں آمنہ کے ساتھ حکیم کے پاس چلی آئی' گھٹا گھٹا نیم تاریک سا ماحول' لکڑی کا بے حد قدیم فرنیچر' وہاں بیٹھی مقامی مریض عوتوں نے مجھے بنظر غائر دیکھا میری انگلیوں میں پڑی ہیرے' فیروزے' پکھراج کی انگوٹھیوں کو' میرے غیر ملکی کپڑے کے لباس کو اور میرے پریشان چہرے' میرے خشک ہونٹوں کو' میں وہیں ان کے بیچ بیٹھ گئی۔ وہ ادھر ادھر سرک

گئیں۔ وہ شاید مجھے یہاں دیکھ کر حیران تھیں اور بے حد مرعوب بھی، مگر مجھے تو اپنی باری کا انتظار کرنا تھا ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ سات آٹھ عورتوں کے بعد میرا نمبر آیا۔ میں ایک چھوٹے سے کمرے کی طرف بڑھی جدھر دوسری عورتیں جا رہی تھیں۔ سامنے حکیم صاحب تھے، سفید ریش، سفید بھنویں بھنچے ہوئے لب، چہرے پر تھوڑی سی سختی لئے، مجھے وہ نوے سالہ "سنیاسی باوا" نظر آئے، میں نے اطہران کے آگے کردیا۔ اور احوال بتاتے بتاتے روہانسی ہوگئی "میں نے جی بہت اچھے اچھے ڈاکٹروں سے علاج کرایا ہے" میں نے معلومات فراہم کیں۔

"بی بی رپورٹیں ہیں تمہارے پاس ڈاکٹروں کی؟ اور نسخے؟۔"

"جی ہاں۔" میں نے جلدی سے ہینڈ بیگ کھولا۔

انہوں نے بہت ماہرانہ انداز میں نسخے اور رپورٹیں ملاحظہ کیں پھر سر ہلایا اور بولے

"بی بی اس بکری کا دودھ پلاؤ اور یہ خمیرہ موتیوں کا کشتہ خرید سکتی ہو؟۔"

"جی ہاں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اچھا تو پھر میں اس دکان کا نام لکھے دیتا ہوں جہاں سے کشتہ مل جائے تینوں چیزیں باقاعدگی سے استعمال کراؤ، بچہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" بلا کا اعتماد اور بے نیازی تھی ان کے لہجے میں "اس بچہ کو جگر کی تکلیف ہے اور کچھ نہیں"

میں سخت حیران ہو رہی تھی کہ اتنی طویل بیماری کا اتنا مختصر سا علاج! مجھے ان کی حکمت پر شبہ ہونے لگا۔ تھوڑا غصہ آمنہ پر اور زیادہ اپنی عجلت پر آیا۔ امی جان اور اسد سے مشورہ کرکے ہی مجھے یہاں آنا چاہیے تھا مگر دل کہہ رہا تھا، یہ علاج آزمانے میں ہرج ہی کیا ہے، لیکن بکری کا دودھ......؟ گھر والے تو شاید اس دقیانوسی علاج پر ہی برہم ہوں کجا گھر میں بکری باندھ چھوڑیں، میری نظر میں ایک دم زرد کانٹا سے اطہر کی سمت اٹھ گئی۔ ہونہہ، ستر بکریاں لے آؤں گی۔ دیکھوں کون منع کرتا ہے۔ میں نے ایک دم اٹل ارادہ کرلیا اگر اسے کچھ ہوگیا خدانخواستہ تو لادیں گے یہ لوگ مجھے ایسا چاند سا بیٹا میں نے حکیم صاحب کی فیس پوچھی فرمایا "دو روپے"

میں سخت حیرانی کے عالم میں اٹھ آئی، پندرہ دنوں میں خرچ کئے گئے ہزاروں روپے کہاں اور

کہاں صرف دو روپے۔

شام کو گھر والوں سے بات کی سب نے میری توقع کے عین مطابق ڈھکے چھپے انداز میں ایک جاہل عورت کی باتوں میں آنے کو میری بے وقوفی کہا کہ جب اتنے مستند معالج بغور علاج میں مصروف ہیں تو ان حکیم صاحب کی اہمیت کیا؟ مگر جب میں نے رونا شروع کردیا تو سب بے بس ہوگئے اسد بولے "اچھا بھئی بکری بھی آجائے گی مگر دودھ کون نکالے گا؟"

"ہو جائے گا اس کا انتظام بھی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

معاملہ طے ہوا میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ میں مغرب کی نماز پڑھنے چھت پر آگئی، نماز پڑھ کر جائے نماز تہہ کر رہی تھی کہ میری نظر بکریوں کے ریوڑ پر پڑی جو دور نظر آنے والے جھونپڑوں کی طرف بڑھ رہا تھا میں کھڑی دیکھتی رہی۔ وہ مچھیروں کی بستی میں داخل ہوگیا۔ میں نے سوچا، بکری خرید کر نگہداشت کے جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس بستی سے ہی منگوا لیا کروں گی میں اپنے ملازم عبدالرحیم کو لے کر فوراً" دودھ کی بات کرنے بستی گئی، یہ دیکھنا بھی مقصود تھا کہ صفائی ستھرائی کا کیسا انتظام ہے

پہلے سے تیسرے جھونپڑے میں جو باہر سے نسبتاً" صاف نظر آرہا تھا دروازہ بجا کر میں اندر داخل ہوگئی گھر کے جتنے افراد تھے مجھے دیکھ کر بوکھلا گئے۔ بانس کے ستون سے لٹکتی لالٹین کی مدہم روشنی چولہے سے ابلتا لکڑی کا دھواں، ہر شے دھندلائی لگتی تھی۔ بکریوں کی بو اور مچھلی کی باس سے میرا دم الٹنے لگا۔ میں دروازے میں کھڑی رہ گئی، ایک عورت جو غالباً" خاتون خانہ تھی۔ میری طرف بڑھی اور بولی "جی میم صیب کا بات ہے؟"

"وہ بھئی تمہاری بکری دودھ دے رہی ہے کیا؟۔" میں نے بات شروع کی۔

"ہاں جی تینوں دے رہی ہیں ماسے اللہ (ماشاء اللہ۔)

"دراصل مجھے کچھ عرصے کے لئے بکری کا دودھ چاہیے اپنے بچے کے لئے۔" میں نے جھونپڑے پر نظر دوڑا کر کہا۔ تیرہ چودہ سال کی ایک لڑکی بڑی پھرتی سے روٹیاں پکا پکا کر ڈھیر لگا رہی تھی۔ اتنی سی لڑکی کا یہ ماہرانہ انداز مجھے چونکا گیا گھر کے سارے افراد میری جانب متوجہ تھے۔

عبدالرحیم باہر ہی کھڑا تھا۔

"کتنا دودھ لوگی میم صیب؟۔"

میں نے یہ جان کر لٹر وٹر جانے ان کی بلا کہا "آدھا سیر صبح' آدھا سیر شام کس حساب سے دوگی؟"

"تین روپے سیر جی' میرے لمڈے کو گھر کا راستہ دکھا دو یہ لے جایا کرے گا۔"

"اف خدایا' کس قدر سستا علاج تھا۔ دل ہی نہیں مانتا تھا کہ شفا ہوگی۔"

"دیکھو میں تمہیں پانچ روپے سیر کے حساب سے دوں گی' یہ ایک ہفتے کے رکھ لو اگر میرے بچے کو فائدہ ہوا تو مہینے کا حساب ہوا کرے گا۔ ٹھیک؟۔" میں نے دو روپے کا اضافہ اپنی خدا ترسی کی عادت سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ اس قدر افلاس دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں جھونپڑوں کو دیکھ کر میرے اندر نخوت و غرور سر نہیں ابھارتے۔ رب کریم کا احسان یاد آجاتا ہے۔ جس نے دنیا کے ہر عیش و آرام سے مجھے نوازا' وہ مجھے بھی کسی جھونپڑے میں پیدا کرنے پر قادر تھا لوگوں کو عسرت کی آگ میں دیکھ کر میرا اپنا وجود سلگ اٹھتا ہے۔

"میں صبح آؤں گی اپنا برتن لے کر اپنے سامنے دودھ نکلواؤں گی۔" بات ان لوگوں سے گھن کھانے کی نہیں تھی۔ معاملہ نازک بچے کا تھا۔ صحت و صفائی کا خاص خیال رکھنا تھا میں پھر گھر آگئی۔

صبح نوکر کے ہمراہ ایک چھوٹی اسٹیل کی بالٹی میں پانی لیا اور ایک منہ بند دودھ کا برتن اور ایک نیل کٹر لے کر میں بستی چلی آئی۔ صبح کا سحر انگیز وقت تھا جھونپڑیوں کے پس منظر میں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا مچھیرے سمندر کی جانب رواں دواں تھے ہر گھر میں شور' زندگی کی علامت بن کر گونج رہا تھا۔ مچھیرن نے بتایا دودھ اس کی لڑکی چمپا نکالتی ہے۔ میں نے تیرہ چودہ برس کی چمپا کے ہاتھ دیکھے اس کے ناخن بڑھے ہوئے تھے میں نے نرمی سے اس کے ہاتھ تھام کر ناخن کاٹ ڈالے۔ وہ کچھ نہیں بولی' بس خاموشی سے مجھے دیکھا۔ پھر اس کے ہاتھ دھلوائے پھر اسے نیپکن دیا کہ ہاتھ اور بکری کے تھن اچھی طرح پونچھ لے' تب اس نے دودھ نکالا اور میں سکون سے دودھ لے کر چلی آئی' عبدالرحیم نے کہا کہ وہ روزانہ یہی عمل دہرا کر دودھ لے جایا کرے۔ البتہ ناخن

دھیان رکھنے کو براہ راست چمپا سے کہا اور نیل کٹر اسے دے دیا۔ وہ ایک تابعدار قسم کی لڑکی نظر آئی جو میرے سامنے خجل سی ہو رہی تھی۔

پھر سب کی حیرانی دیدنی ہوگئی جب اطہر کے رخسار کھل اٹھے ایک ماہ میں میرا بیٹا ایسا ہوگیا مانو کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ وہ بچہ جو کھڑا ہونا بھول گیا تھا بھاگنے کی کوشش کرتا میں نے اور میری ساس نے ڈھیروں نفل شکرانے کے ادا کئے یتیم خانے میں کھانا بھجوایا چمپا کے اور اس کے گھر والوں کے لئے کپڑے بنائے کہ عید بھی قریب تھی۔ نوکروں کو بہت کچھ دیا۔ میرا سسرال فراغ دل بہت ہے اور کچھ خدا کا بھی بے حد کرم ہے۔

انہی دنوں بھابی کے ہاں آمد آمد تھی۔ امی جان تو اپنے نوابی مزاج کے عین مطابق ہل کر پانی پینا بھی کسر شان سمجھتی تھیں۔ گھر میں کل تین نوکر تھے آیا کے علاوہ ایک عبدالرحیم آمنہ اور لاڈو' ہمیں تو یہ تین بھی نعمت ہی لگتے تھے۔ چوکیدار صرف گیٹ سے متعلق تھا۔ لاڈو کی زچگی بھی انہی دنوں ہوئی' وہ چھٹی پر تھی مجھے ہر وقت مصروف رہنا پڑتا۔ ادھر اطہر کو صرف میری عادت تھی۔ ورنہ بری طرح رونے لگتا پھر گھر صرف نوکروں ہی سے نہیں چلا کرتے اپنی مرضی کا کام لینے کے ساتھ ساتھ دیکھنا پڑتا ہے ویسے بھی مجھے کاہل الوجود عورتوں کی طرح بغل میں بچہ داب' رونے کا بہانہ کر کے آرام کی عادت نہ تھی۔ احمد میرا بڑا دیور یونیورسٹی پڑھتا تھا اور چھوٹا کالج میں' بھابی کو اپنے بچیوں کے کام بہت ہوتے تھے۔ ان کی بچیوں کی آیا شادی رچا کر دادو جا چکی تھی۔ ان کی تو اپنی جان عذابوں میں تھی اٹھتیں تو ہائے کرتیں' بیٹھتیں تو ہائے کرتیں۔ پیروں پر ورم' چہرے پر ورم' بچیاں بھی باقاعدگی سے پٹنے لگی تھیں۔ میرے جیٹھ نے شاید کبھی ایسا "کرائسس پیریڈ" نہیں دیکھا تھا۔ فوراً" اخبار میں آیا کے لئے اشتہار دے دیا تھا اب بھابی "ہر بیل" پر خود' ہائے میرے مولا" کہہ کر اپنی ٹنوں وزنی جان لے کر اٹھا کر کہ کوئی شاید آگئی" ہو پھر روہانسی ہو کر کہتیں "ہائے زیب "تم کیسے اطہر کو سنبھال لیتی ہو؟" شاید بھابی کی نظر لگ گئی۔ اطہر گھر کے کاموں میں مجھے سخت پریشان کرنے لگا پہلے پہل تو ساس نے بچوں کو بھلانا چاہا پھر ایک دن بے زاری سے کہنے لگیں "تم لوگوں نے بچوں کو بہت سر چڑھا لیا ہے ایک ہمارے بچے تھے پتا ہی نہیں چلا کب بڑے ہوگئے

ہماری مغلانی بی آرام سے پان چبایا کرتیں تھیں اور مفت کا ماہانہ لیتی تھیں"

آخر ایک روز میں چمپا کو لے آئی اس کی ماں کی سو منتیں خوشامدیں کر کے اور اسے اطہر کی نگہداشت پر مامور کر دیا۔ جتنا بڑا گھر ہوتا ہے' اتنے ہی بکھیڑے ہوتے ہیں۔ اطہر روتا تو میں اسے سنبھال لیتی اور چمپا سے دوسرے کام لے لیتی' چمپا سے مجھے بہت آرام ہو گیا بس ایک مرتبہ کافی ہوتا تھا صبح آٹھ بجے آتی تھی اور شام پانچ بجے واپس چلی جاتی تھی۔ جاتے ہوئے میں اسے کھانا اور پھل وغیرہ دے دیا کرتی تھی لائی تو میں اس اطہر کے لئے تھی مگر بھابی بھی آواز دے لیا کرتیں' کبھی امی جان پکارتیں "اے چمپا چمیلی (چنبیلی) ذرا میرے سر میں تیل ڈال دو" انہیں "اکہرا" نام لینے کی عادت نہ تھی وہ خود چمن آرا تھیں۔ میاں مرحوم عبدالصمد خان' بیٹے اسد خان' فلاں خان فلاں خان' بہوئیں چھوٹی دلہن بیگم' بڑی دلہن زرتاج اور اب چمپا چمیلی۔

بہرحال چمپا کو یہاں کوئی روک ٹوک نہ تھی ہنستی کھیلتی پھرتی تھی' جی جان سے کام کرتی تھی پانچ بجے تک اس کے پاؤں میں چکر رہتا۔ اچھا کھانے کو ملا تو ٹہلتا لڑکپن' دوڑتی بھاگتی' جوانی میں بدل گیا۔ آج تک مجھے ان غریب گھروں کی لڑکیوں کی چیختی چلاتی جوانی سمجھ میں نہ آئی امیر گھروں کی اک بانس کی مانند سفید چرخ لڑکیاں جو میرے اردگرد تھیں ان کے پھوٹنے اور پھٹنے کا پتا ہی نہ لگتا تھا۔

......*

اطہر سو رہا تھا' میں بھی آرام کرنا چاہ رہی تھی۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے امی جان یعنی میری ساس اپنی بہن سے ملنے کوئٹہ گئی ہوئی تھیں۔ بھابی اور بچیاں بھی آرام کر رہی تھیں اسد اور میرے جیٹھ اپنے اپنے کاموں سے حسب معمول باہر تھے۔ چھوٹا دیور کالج سے نہ لوٹا تھا احمد کی چھٹیاں تھیں کئی روز سے' چمپا بڑی بے نیازی سے لہرا لہرا کر ڈائننگ روم کی میز صاف کر رہی تھی۔ میں اس کے پاس آئی اور کہا "چمپا میرے کمرے میں آ کر قالین پر سو جانا" آرام کر لو تم بھی اب کوئی کام باقی نہیں ہے۔"

بولی "بیگم جی میں ادھر برآمدے ہی میں سو جاؤں گی۔"

"اچھا۔" میں نے برآمدے کا پنکھا چلا دیا اور خود اپنے ٹھنڈے نیم تاریک کمرے میں آ گئی' میں

آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹی تھی کہ اطہر جاگ پڑا میں نے چمپا کو آواز دی۔

"چمپا......"

"چمپا......"

آخر مجھے خود ہی اٹھنا پڑا' شاید سو گئی ہے میں فرج سے سیب کا جوس لینے خود اٹھ کھڑی ہوئی' باہر آئی تو دیکھا چمپا برآمدے میں نہیں تھی۔ میں سمجھی باتھ روم میں ہو گی میں کھانے کے کمرے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ مجھے امی جان کے کمرے سے کھسر پھسر کی آواز آئی۔ میں ٹھٹھک گئی۔ اڑتے پردے کے پیچھے میں نے دیکھا۔ چمپا امی جان کے کمرے کی وارڈ روب کے پاس کھڑی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا' میں اندر بڑھنے کو ہی تھی کہ احمد کی آواز نے میرے قدم زمین میں گاڑ دیئے وہ کہہ رہا تھا دیکھو چمپا....."

"ہاں جی کیسے خوبصورت ہیں یہ بندے۔"

"ہائے اللہ' یہ ہار کیسا ہے' بالکل نولکھے ہار جیسا۔" اس کی آواز خوشی سے تھرا گئی

"نولکھے ہار جیسا۔" احمد کی آواز میں تعجب تھا۔

"ہاں جی میرا بھائی ایک کہانی لایا تھا ہمیں سنان واسطے۔"

اس پر بالکل ایسے ہار کی فوٹو بنا تھا سچی بالکل ایسا" چمپا کا الھڑ مشتاق سا لہجہ"

"یہ نولکھا ہار ہی ہے چمپا پہنے گی؟۔"

"ناں جی' اپنی ایسی قسمت کہاں۔" آواز میں مایوسی وافسردگی چھا گئی۔

"نہیں تو پہن کر تو دیکھ۔"

"نہیں..... نہیں.....جی....." آواز کانپ رہی تھی۔

"میں دونگا بالکل ایسا ہار بنوا کر۔" احمد کا پرچانے والا لہجہ

میں سن کھڑی رہ گئی بے تکلفی بتا رہی تھی کہ اس سے قبل بھی باتیں ہوتی رہی ہیں۔ میری تو اس خیال سے روح کانپ گئی' خدایا کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو اس کی ماں کو کیا جواب دوں گی؟ احمد یقیناً امی جان کا لا کر کھولے کھڑا تھا' میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے پاس چابی کہاں سے آئی؟ مگر اس

وقت مسئلہ چابی کا نہ تھا' میں بے دھڑک اندر گھس گئی۔ رنگے ہاتھوں پکڑنے کے خیال سے مجھے دیکھ کر دونوں کی روح فنا ہوگئی چمپا تو لپک جھپک باہر بھاگ گئی' اور احمد خود کو میری نظروں سے بچاتا ہوا بولا "بھابی بیگم" یہ کیسی لڑکی لے آئیں ہیں آپ؟ امی جان کی وارڈ روب کھولے کھڑی تھی۔ جانے کس نیت سے وہ تو شکر ہے کہ میں آگیا۔ میں اسے ڈانٹ ہی رہا تھا کہ آپ آگئیں"۔

انسانوں کی ڈھیروں اقسام میں سے ایک قسم خاصی "مطلبی" کی بھی ہے مطلبی' بزدل بھی ہوتا ہے اور بزدل اپنے بچاؤ کی خاطر اپنی مصنوعی عزت کی خاطر بڑے سے بڑا بہتان باندھ سکتا ہے' گلوں پر چھری پھروا سکتا ہے۔ مجھے احمد سے سخت گھن محسوس ہوئی' ایک غریب مسکین پر کس ڈھٹائی سے الزام تراشی کر رہا تھا۔ وہ وارڈ روب کے پٹ بند کر چکا تھا' میں کھولتی ہوئی جوس لے کر واپس اپنے بیڈ روم میں پہنچی تو چمپا اطہر کو تھپک رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کا جسم لرزنے لگا۔ چودہ برس کی لڑکی جو اپنی عمر سے تین سال بڑی نظر آتی تھی۔ ماں کہتی ہے چودہ کی ہے وہ خود کو پندرہ برس کی بتاتی مگر اس کا ظاہر ان دونوں عمروں کو مسترد کرتا تھا۔

"کیا کر رہی تھیں تم وہاں؟" میں نے سخت غصیلی نظروں سے اسے دیکھا۔

"جی وہ میں تو برآمدے میں لیٹی تھی' احمد صاحب نے مجھے کھڑکی میں سے بلایا تھا میں سمجھی کوئی کام ہوگا۔"

"کیا کہتا ہے وہ؟"۔

وہ چپ رہی۔

"کیا پوچھ رہی ہوں میں؟"۔

"وہی چپ۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جھنکا دیا۔

"کم بخت سنتی نہیں کیا؟"۔

"کچھ نہیں جی۔" اسکا وجود لرزنے لگا۔

"دیکھ میں نے سب کچھ سن لیا ہے' سب سے پہلے کہاں بات کی تھی اس نے؟"۔

چپ.... مستقل چپ....

"دیکھ چمپا مار مار کر درگت بنا دوں گی صحیح بات بتا مجھے' تیری ماں سے الگ تیرا کچومر بنواؤں گی" میں بھڑک اٹھی "کہاں بات کی تھی پہلے اس نے؟"

"بیگم جی میرے کو غلط نہ سمجھو۔"

"جو میں پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دو صرف۔"

"جی پرسوں شام کو جب میں چھت پر کپڑے اتارنے گئی تو احمد صاحب اوپر تھے۔ انہوں نے جی میرے گلے پر چٹکی کاٹ لی تھی۔ میں تو ڈر گئی تھی کہنے لگے تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔"

"ہوں تو کون سا اپنے قابو میں ہے' بہت خوش ہوئی ہوگی' ورنہ اس کے بلانے پر یوں جاتی؟ مجھ سے شکایت نہ کرتی؟۔"

"احمد صاحب کہہ رہے تھے بہت ضروری کام ہے اور جب اندر گئی تو وہ بہت سارے نوٹ نکال کر گننے لگے۔ پھر انہوں نے الماری میں سے بہت سے زیور نکالے اور ڈبے کھول کر مجھے دکھانے لگے.....۔"

"اور پہنا کر بھی دیکھنے لگے۔" میں نے بھبھک کر بات کاٹی۔

"نہیں جی.....۔" وہ میری سمت خوف زدہ ہرنی کی طرح دیکھ کر بولی "پھر انہوں نے ایک بڑا سا ہار نکالا......"

"اچھا بس بس' سب سن لیا تھا میں نے۔"

وہ گردن ڈال کر بیٹھ گئی' سہمی.... سہمی..... میرا جی نہ چاہا کہ اسے "مکر کی پڑیا" کہوں تجھے کیسے لگتے ہیں احمد صاحب؟ تیرا بیاہ کرا دوں ان کے ساتھ؟" میں نے کوئی سزا مقرر کرنے سے پہلے ایک نفسیاتی حربہ آزما کر اس کے جی کا بھید لینا چاہا تو وہ کانپ کر فرش سے اٹھ گئی۔

"بیگم جی میرے کو معاف کردیو اب مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوے گی' قسم اٹھالوں آپ بولو تو۔" وہ جھرجھری رو پڑی۔

مجھے اس پر ترس آگیا "اچھا چل اٹھ کھڑی ہو' رونے دھونے کی ضرورت نہیں ہے اچھا چل

اطہر کو یہ جوس پلا اور خبردار جو تو آئندہ احمد کے بلانے پر گئی' کمینی' مردوں کی باتوں پر آ کر لڑکیاں کہیں کی نہیں رہتیں"

اس دن کے بعد وہ بہت محتاط ہوگئی میری نظریں ہر دم اس کا احاطہ کئے رہتیں وہ کچن میں ہوتیں تو احمد کا بہانے بہانے کچن میں جانا اور اطہر اور بھابی کی گڑیا کے ہمراہ لان میں جاتی تو وہ کتاب اٹھائے وہیں چلا جاتا مجھے سخت تعجب ہوتا کہ اسے کیا ہوگیا ہے یونیورسٹی میں پڑھتا ہے ایک سے ایک طرح دار لڑکی ہوتی ہے وہاں' اگر وہ کسی اچھے گھر کی لڑکی پسند کرلے تو یقیناً" گھر میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ خود احمد میں بھی مردانہ حسن کی کمی نہیں خوبصورت قد وقامت' سنہرے خوب صورت ہیئر اسٹائل کے ساتھ اس قدر جاذب نظر لگتا تھا کہ یقیناً" لڑکیاں اس کی طرف ضرور متوجہ ہوتی ہوں گی ایک یہ چمپا' دلفریب اور کچھ بوری سی' مہک دیتی جوانی کے علاوہ ہر طرف سے بالکل کنگال' پھر مزاج میں بے حد بچپنا تھا' بس ہر وقت لہراتی ہلکورے لیتی پھرا کرتی' نامراد کی شاید یہی ادا بھا گئی ہوگی چمپا جسے پہننے اوڑھنے کی تمیز نہ چلنے پھرنے کی' غریب مچھیرے کی عسرت کی ریت پر تڑپتی بے ابا مچھلی' کئی بار جی میں آئی اسد یا اپنی ساس سے احمد کو سمجھانے کو کہوں' مگر ثبوت؟ وہ تو جھٹ کہہ دے گا۔ کچن' لان' چھت گھر سے خارج ہیں کیا؟ یا ادھر میرے جانے پر پابندی ہے؟ پھر میں کیا جواب دوں گی؟ الٹا خود کو نظروں سے گراؤں گی اس چمپا کو ہی چھٹی کرائے دیتی ہوں۔ پر اس کا نعم البدل کہاں سے لاؤں؟ بھابی اور ساس کو کیا جواز پیش کروں؟ وہ دونوں تو اس قدر اس کی عادی ہوگئیں ہیں کہ اس کے غیر حاضر ہونے پر اس کے جھونپڑے تک پہنچ جائیں گی' وجہ پوچھیں گی اس کم بخت چمپا ہی کو کہوں کہ کوئی بہانہ کرکے دفعہ ہوجا

مگر وہ بے وقوف تو سن کر ہی رونے لگی "بیگم جی" میری ماں کہیں اور نوکری نہ کرنے دے گی۔ آپ کے گھر کام کرکے میرے گھر والوں کو آرام مل جاتا ہے۔ غریبوں کی دعالیں جی' اب میں کہاں جاؤں؟"

"اچھا چل فالتو باتیں نہ بنا فارغ وقت میں کاپی پنسل لے کر بیٹھا کر' کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لے۔ کام آتا ہے' میں اس کے رونے دھونے سے متاثر ہوگئی تھی۔"

اس دن کے بعد سے وہ روزانہ ظہر کے بعد کاپی پنسل لے کر بیٹھ جاتی۔ میں نے اسے حروف اور ہندسوں کی پہچان کرائی آہستہ آہستہ اسے اردو لکھنا آنے لگی۔

سو تک گنتی بھی لکھنے لگی۔ اس پر امی جان نے کہا تھا "چھوٹی دلہن بیگم' اب کیا سکول بھی داخل کراؤ گی اسے لوٹھا کو"

نہیں امی جان اتنا تو ہر انسان کو لکھنا پڑھنا آنا چاہیے کہ خط وغیرہ پڑھ لے"

پھر سنا کہ اس کی ماں مرگئی وہ کئی دن تک نہ آئی میں ذرا دیر کو تعزیت کے لئے گئی' احمد نے مجھ سے تو نہیں البتہ ماں سے پوچھا "امی جان وہ نوکرانی چلی گئی ہے کیا؟"

کسی لڑکی کے لئے مرد کا یہ دہرا پن صاف بتاتا ہے کہ وہ اس کے لئے پاکیزہ محبت جیسے لطیف جذبات نہیں رکھتا بلکہ اس سے فقط کوئی "خاص مطلب" رکھتا ہے گھر والوں کے سامنے اسے حقارت سے نوکرانی کہنا اور آنکھ بچا کر سینے سے لگانے کے بہانے بھی ڈھونڈنا۔ چمپا کو بھی شاید اس گھر لت لگ گئی تھی۔ دو مہینے بعد پھر آگئی ہمارا کیا جاتا تھا۔ آرام ہی ملتا تھا' لوگ تو ایسے پھرتیلی ملازماؤں کی آرزو کرتے ہیں جو پھرتیلی بھی ہوں اور مرضی کے مطابق کام بھی کریں بس اب یہ تھا کہ اس نے کام کے اوقات میں تخفیف کردی تھی یعنی ایک گھنٹہ پہلے چلی جاتی تھی۔

سعد کی بی ایس سی میں اپنے کالج کی پہلی پوزیشن آئی تھی۔ سعد میرا چھوٹا دیور تھا پڑھنے کا انتہائی شوقین گھڑی دیکھ کر کام کرنے کا عادی' انتہائی منظم مزاج کا مالک سب کو بہت عزیز تھا۔ اسد نے خوش ہوکر اس کے اساتذہ دوستوں اور دیگر ملنے جلنے والوں کے لئے پارٹی کا انتظام کرڈالا سعد ایف ایس سی میں چند نمبروں کی کمی کی وجہ سے انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلے سے رہ گیا تھا۔ اب اس نے بہت محنت کی تھی۔ سب کو امید تھی کچھ نہ کچھ ضرور بن جائے گا میں بھی بہت خوش تھی۔

گرمی کی وجہ سے کھانے پینے کا انتظام چھت پر کیا تھا۔ اس لئے وہاں کی تیاری بہت پہلے کرلی تھی۔ میں یہ دیکھنے کے لئے کوئی کمی نہ ہو' اوپر آئی تو دھک رہ گئی اوپر بنے ہوئے دو کمروں کے شیڈ کے نیچے چمپا احمد کے بازوؤں میں تھی۔ وہ اس کے مضبوط بازوؤں کا گھیرا توڑنے کی مقدور بھر کوشش تو ضرور کررہی تھی مگر اس کوشش میں بے زاری' نفرت یا اکتاہٹ نہیں تھی۔ حرافہ! کوئی

گل کھلا کر ہی رہے گی۔ کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ اس کمینی پر' کیسے میری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی ہے۔ اس بار میں نے چمپا کو نہیں' احمد کو آواز دی "احمد....."

احمد نے بری طرح بوکھلا کر چمپا کو چھوڑ دیا۔ مجھے دیکھ کر بے اندازہ خجل ہو رہا تھا' میں طنطنے سے اس کے سر پر پہنچ گئی۔

"احمد' تمہیں شرم نہیں آئی یہ نیچ حرکت کرتے ہوئے کم سے کم اپنی حیثیت ہی کا اندازہ کر لیا ہوتا اتنی رزالت کی توقع کسی کو بھی نہیں ہوگی تم سے اور تو......" میں نے چمپا کے بال پکڑ کر بے دریغ دو طمانچے رسید کر دیئے "کمینی شکل پر بارہ بجائے رکھتی ہے اور کام یہ دکھاتی ہے' ابھی سے تیرا یہ حال ہے' جوانی ڈھنگ سے چڑھ آئی تو خدا جانے کیا کیا نہ کر چھوڑے گی۔ مکر کی پڑیا بے غیرت میں نے غریب مسکین سمجھ کر تیری مدد کرنا چاہی اس کا تو نے یہ صلہ دیا" احمد وہاں سے فوراً" کھسک گیا تھا چمپا نے اس کی سمت مدد کو دیکھا تھا۔

"نیچے چل' میں امی جان کو اپنی کمرے میں بلاتی ہوں تو اپنے منہ سے احمد کی شکایت کرے گی ان سے سمجھی۔"

"نہیں..... جی نہیں آپ مجھے گھر سے نکال دیں مگر میں یہ نہیں کروں گی وہ تھرا کر روتی ہوئی بولی۔"

"نکاح پڑھوالیا ہے کیا' جو اتنی پردہ داری کر رہی ہے؟۔" اس کی ڈھٹائی سے میرا بھیجا ہی الٹ گیا۔ چل نیچے امی جان کے پاس"

"نہیں' جی نہیں آپ میرے کو جتنی مرضی مار لو۔"

اف خدایا' وہ ایک دم میرے لئے سانپ کی چھچھوندر بن گئی تھی نہ اگلتے بن رہی تھی نہ نگلتے میں نے چٹیا سے پکڑ کر نیچے کی جانب دھکا دیا "دفعان ہو جا اور آئندہ اپنی منحوس صورت لے کر اس گھر میں کبھی داخل نہ ہونا"

احمد کو میں جانتی تھی۔ بے حد بگڑا ہوا اور بدلحاظ تھا اور میں بغیر ثبوت کے امی جان سے بات کرتے ڈرتی تھی اور اسد سے بھی وہ تو فوراً" مجھے جھٹلا دے گا۔ میں ہی بری بن رہ جاؤں گی یا پھر یہ

لوگ سارا قصور چمپا ہی کا ٹھہرائیں گے۔ امی جان کی نظر میں تو بیٹے بالکل ہی "ننھے" تھے گویا کل ہی بوتل چھٹی ہو' اب اپنا بھرم قائم ہے تو اس کلموہی کی خاطر وہ بھی گنوا دوں؟ نامراد کو کس قدر سمجھایا۔ ٹھیک ہے بھرے گی خود ہی۔

اس دن کے بعد چمپا کی شکل نظر نہ آئی' ساس نے اور بھابی نے دریافت کیا تو میں نے کہہ دیا" اب ماں نہیں ہے اس کی' نہیں آنے دیتا اس کا باپ جوان لڑکی کو"

اس واقعے کے سات آٹھ ماہ بعد میں ایک مہینے کے لئے اپنے میکے حیدر آباد آئی تھی اپنی ایک پرانی سکھی سے ملنے بھی جانا ہوا ٹھنڈی سڑک پر موٹر دوڑاتے ہوئے (جو میرے بڑے بھائی کی تھی) مجھے یاد آیا کہ اطہر کے سیرپ وغیرہ بھی ختم ہو گئے ہیں تب میں نے گاڑی نزدیکی بازار کی سمت موڑ لی مگر جھٹکے سے رک جانا پڑا۔ سامنے کسی موٹر سائیکل سوار کو ایک ٹرک نے لقمہ اجل بنا دیا تھا پورا ٹریفک جام تھا اف خدایا خدا معلوم کب یہ اندھا دھند ریننگ ختم ہوگی' میں نے طویل معاملہ جان کر انجن بند کر دیا اور اسٹیرنگ پر بازو رکھ کر ٹریفک کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ بالوں کو اڑنے سے بچانے کے لئے میں نے نماز پڑھنے کے اسٹائل میں دوپٹہ منڈھ رکھا تھا اور بڑے بڑے ڈبل شیڈ گلاسز بڑی آنکھوں پر تھے لوگ گاڑیوں سے اتر رہے تھے۔ حادثے سے زیادہ میری جانب متوجہ تھے۔ عورت بدشکل بھی نہ ہو اور پر اعتماد بھی ہو' پھر شاندار موٹر بھی چلا رہی ہو تو جانے کیا بن جاتی ہے۔ مجھے اپنی پریشانی تھی کہ میرا بچہ پریشان ہو رہا ہوگا کہیں اسد کا فون نہ آیا ہو۔

"بی بی' اللہ بھلا کرے گا تیرے بچے سکھی رہیں ایک مانوس آواز پر میں نے چونک کر سر اٹھایا اور آنکھوں سے گلاسز اتار دیئے لیرم لیر سندھی اجرک میں چمپا کھڑی تھی۔"

"ارے تو یہاں کہاں؟۔" میں ہکلا کر رہ گئی۔

وہ جواب دینے تو لگی تو اس کی آواز بھرا گئی "بیگم جی بیگم جی میں کراچی سے بھاگ آئی ہوں۔

"کس کی خاطر؟ پھر کوئی نولکھے ہار والا مل گیا تھا؟۔"

میں طنزیہ بولی۔

"بیگم جی' احمد صاحب نے مجھ سے بیاہ کرنے کی قسم کھائی تھی اور کہا تھا وہ مجھے بہت نولکھے ہار

بری میں چڑھائیں گے۔ مگر وہ بے ایمان نکلے آپ ٹھیک کہتی تھیں وہ بہت ظالم ہیں میں گھر سے بھاگ آئی ہوں، مرنے کے ڈر سے نہیں، اپنی وجہ سے اپنے باپ کو کیوں پھانسی پر چڑھاؤں؟ مرنا تو اب میری تمنا ہے جی، مگر میں احمد میاں کو کبھی معاف نہ کروں گی۔"

ہونہہ وہ تو تیری معافی کے انتظار میں بوڑھے برگد میں جھول رہا ہے جیسے۔

"میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" اس نے اجرک سے آنسو صاف کرنا چاہیے اور میرے کلیجے میں ایک میخ سی گڑ گئی، تو تو تباہ ہو گئی ہے بدنصیب، اس کی اجرک ڈھلکنے سے گویا میں نے کشف القبور کا عمل تمام کرلیا۔ تب ہی تو کہوں کہ اسے ایک دم اتنی سیانی باتیں کرنا کیسی آگئیں مگر میرا حساس دل تڑپ اٹھا اسے تباہ کرنے والا میرے اپنے گھر کا فرد تھا۔ اگر تو میرا ساتھ دے دیتی احمق لڑکی، تیری ایک شکایت، میری ایک گواہی احمد کے سر میں جادو کی کیل بن کر گڑ جاتی اور پھر اس کی مجال نہیں تھی اس کی اصلیت ظاہر ہو جاتی مگر بدبخت اس میں تیرا بھی قصور ہے چی تھی عشق کرنے۔ ادھر میں یہ سوچ رہی تھی اور ادھر سڑک کب کی کھل گئی تھی لوگ میری گاڑی آگے نہ بڑھنے کی وجہ اس فقیرنی کو سمجھ رہے تھے اور اسے مغلظات بک رہے تھے۔ ہارن دے رہے تھے۔ میں نے جلدی سے چابی گھما کر ایکسلیٹر دبا دیا وہ پرے ہٹ گئی میرے کان سنتے رہ گئے "انہیں میری آہ لگے گی، وہ پھونک دے گی انہیں" میں گم صم ہو کر رہ گئی، اور بہت جلد سسرال واپس آگئی۔

میرے ذہن سے چمپا چمٹ کر رہ گئی میرا احساس رو پڑتا، جب اس کے گھر کا دھیان آتا کئی مرتبہ تو اس قدر جذباتی ہو گئی کہ اسد سے کہنے لگی مگر عقل نے ٹھوکا مار دیا کیا کرنے لگی ہو اس کے ذہن میں تو وہ بہت "ننھا" ہے بالفرض محال ان کے ذہن نے تسلیم بھی کرلیا تو وہ اظہار کر کے اپنی خاندانی عزت وجاہ کو مٹی میں ملا دیں گے۔

صبح ہی صبح گھر میں کھلبلی مچ گئی سب چوکیدار کے پیچھے پڑے تھے اور وہ گھبرا کر قسمیں کھا رہا تھا" خدا کسم ام سچ بولتا، ام اور کسی کو آتا نہیں دیکا"

"بھلا تمہارا کیا کام جب کوئی اس قدر آسانی سے گیٹ تک آجائے بھابی برہمی سے بولیں احمد

یونورسٹی جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا وہ ٹائی باندھتا ہوا وہیں چلا آیا۔ مگر پیوندی گونڈری میں ہلتی زی روح کو دیکھ کر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ ننھی روح زور سے چیخنے لگی۔ بوڑھے چوکیدار نے گود میں اٹھا کر ہلانا شروع کردیا۔ تب چار چھ کالی چوڑیوں سے بندھا ایک کاغذ نیچے گرا پڑا سب اس کی سمت لپکے مگر اسد نے اٹھا لیا میں ان کے پیچھے کھڑی تھی، انہوں نے کھولا ٹوٹی پھوٹی تحریر میں لکھا "احمد کے گلے کے لئے نولکھا ہارا" جس، جس نے پڑھا اس کی نگاہ احمد کی جانب بے ساختہ اٹھ گئی وہ بری طرح بوکھلا گیا گڑبڑا کر بولا

"خدا معلوم کس نے بے ہودہ مذاق کیا ہے؟۔" اس کی جھلاہٹ میں خوف حیرت اور کشمکش تھی بے صرف میں ہی محسوس کر سکتی تھی۔

آس پاس کے بنگلوں سے بھی لوگ آئے جن میں ملازمین کی تعداد زیادہ تھی کسی نے پولیس کو خبر کردی تھی۔ اور اب پولیس آچکی تھی چوکیدار سے بیان لیا جا رہا تھا اس نے بتایا وہ گیٹ کے نزدیک ہی رہا ہے فجر کے وقت اس نے دیکھا، یہ جان پڑی کسی کی جان کو رو رہی تھی۔

"اور کچھ نہیں تھا اس بچے کے ساتھ؟۔" تھانیدار نے دریافت کیا۔

"نہیں۔" اسد نے بے حد عجلت میں جواب دیا میں نے ان کی سمت دیکھا۔ وہ نگاہ چرا گئے چوکیدار بچے کو چپ کرانے میں مصروف تھا اس نے کاغذ کا پرزہ نہیں دیکھا تھا اور شاید یہ اس گھر کے لئے غنیمت تھا۔

"اوئے اخلاق، اسے اٹھالو اس کے وارثوں کی تلاش ہوگی، نہ ملے تو یتیم خانے بھجوا دیں گے۔ اوئے اخلاق، اوئے اخلاق اسلم" تھانیدار کی آواز گونج رہی تھی۔

میں نے احمد کی سمت دیکھا۔ وہ مجھے دیکھتا پا کر زرد سا ہو گیا اور اندر بڑھ گیا۔ ہونہہ اب نوابوں کا پوتا یتیم خانوں میں پلے گا۔ حالانکہ یہ نولکھا ہار تو احمد کے گلے کے لئے آیا تھا یتیم خانے کے گلے کے لئے نہیں۔

جب ہم سب اندر لوٹ رہے تھے تو ہر ایک کی چال اس کی ذہنی کشمکش کا پتا دے رہی تھی۔ سب اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوال کا جواب جان کر بھی نہیں جاننا چاہتے تھے۔

میں نے پلٹ کر گیٹ کی طرف دیکھا چمپا کا نولکھا ہار، پولیس یتیم خانے کے خزانے میں جمع کرانے جا رہی تھی۔ کہ ورثاء تو ملنے سے رہے اور ایسے نولکھا ہار یتیم خانوں کے لاکر ہی میں محفوظ ہوتے ہیں، یا "ڈبا پیکنگ" میں گندے نالوں کی تہہ میں اتر جاتے ہیں۔

......*

بند دروازہ

کیا ابھی سن میں عقل کی ڈگریاں بھی ملنے لگی ہیں؟ وہ باتھ روم سے منہ پونچھتی ہوئی اور مسکراتی ہوئی باہر آئی تھی....."

کیا مطلب..... صوفیہ نے حیرانی سے خوش رو کو دیکھا

مطلب یہ کہ ہمارا شاہ زمان تو عقل میں بھی گریجویٹ لگنے لگے ہیں..... اس نے مسکرا کر شاہ زمان کو دیکھا۔

اس کا مطلب ہے آپ ہماری باتیں سن رہی تھیں.....؟ شاہ زمان نے گھورا..... مطلب وطلب تم جانو.... میری مجبوری یہ ہے کہ میں باتھ روم کا دروازہ تو بند کر سکتی ہوں کانوں میں دروازہ ہی نہیں تو کیا کیا جائے؟۔

"ہوں.... تو آپ نے ہمارا سارا پلان سن لیا محترمہ....؟ دیکھیں خوش رو تم نے باہر آزاد پراپیگنڈہ کیا۔ تو ہم تم سے اچھی طرح نمٹ لیں گے۔ شاہ زمان نے دھمکی دی۔"

"ایسا کرو....." وہ سنجیدگی سے بولی۔

"جی....؟۔" سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"میرے منہ میں وہ نیلا دوپٹہ ٹھونس دو.... اس نے سامنے دوپٹے کی طرف اشارہ کیا....اور فری تم اپنے دونوں پراندوں سے میرے دونوں ہاتھ پاؤں باندھ دو۔"

"کیا مطلب....؟۔" سب چیخے۔

بھئی پیٹ کے ملکوں کا اس سے بہتر علاج میری نظر میں نہیں' وہ بڑی افسردگی سے بولی۔

دیکھیں خوش رو آپی..... آپ..... یہ نہیں کریں گی..... فری چیخی..... شاہ زمان نے پلٹ کر وارڈ روب کھولی... ایک دم واپس خوش رو کی سمت مڑا..... اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا اصلی پسٹل چمک رہا تھا

"شوٹ کردوں گا خوش رو میں تم کو۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑی' چولہے پر بیٹھے رہتے ہو ہردم..... ؟ جیسے شوٹ ہی تو کردو گے' مت کیا کرو ایسے ڈرامے جاؤ تم سب پہ ترس کھایا..... نہیں کہیں گے کسی سے..... پھر شاہ زمان کے کاندھے پہ ہاتھ پھیر کر چڑانے والے انداز میں مسکرائی دراصل ہم ڈر گئے تمہاری اس "توپ" سے..... ہمارا دل تو اس کی "نال" سے بھی چھوٹا ہے۔

مجھے پتا تھا آپی ایسی نہیں ہیں..... اور پھر آپی ہم بدتمیزی تو نہیں کریں گے فری نے اچک کر اس کا رخسار چوم لیا وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

آج اس کی پھوپھی زاد سامیہ کی مایوں تھی اور ان سب شیطانوں نے دادا جان اور دادی جان کا ڈرامہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور ظاہر ہے "اشیائے ضرورت" دادا دادی ہی سے اڑائی تھیں اور اسی کا وہ پلان بنا رہے تھے جو خوش رو نے سن لیا تھا شاہ زمان ان سب کا لیڈر بنا ہوا تھا تین دن پہلے ہی سے پھوپھی جان کے ہاں خاندان بھر کے لڑکیوں کا اجتماع ہو گیا تھا جو زمین و آسمان ایک کئے دے رہے تھے۔

خوش رو کیونکہ "سینئر بچوں میں شامل تھی۔ اس لئے اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی تھیں اس لئے وہ اس شیطان پارٹی کے پروگرام میں اکثر شمولیت سے قاصر رہتی تھی۔ اور یہی ہوا تھا وہ نکلی تو دیکھا اس کی پکار پڑ رہی تھی۔

ارے بیٹا کہاں چلی گئیں تھیں..... کھانے کا وقت ہو چلا ہے اور مٹر پلاؤ ابھی باقی ہے ذرا دم کرلو میں تمہارے پھوپھا کا قیمہ بھون دوں' وہ مارے بوکھلاہٹ جانے کیا بول گئیں۔

خوش رو بے ساختہ ہنس پڑی..... رحیم کیجئے پھوپھو ایک تو بے چارے کا قیمہ بنائیں گی اور پھر

بھونیں گی بھی.....

اے جانے کیا اول فول بک گئی ہوں' وہ ماتھا پیٹ کر بولیں' تم ذرا جلدی سے مٹر پلاؤ چڑھا دو' یہ لڑکیاں تو جانے کون سے بلوں میں گھس جاتی ہیں کام کے وقت..... وہ بڑبڑاتی کچن کی سمت چلیں تو وہ ان کے پیچھے ہولی۔

خوش رو آپی میری گولڈن پنیں دیکھیں ہیں؟ ابھی یہیں تو رکھی تھیں رومی روہانسی ہو رہی تھی۔

میں نے دیکھیں ہیں شاہ زمان کی آواز آئی۔ میں سمجھا ٹائی کی پنیں ہیں وہ مسکین انداز میں گویا ہوا۔

کہاں کہاں..... رومی تو اس پر چڑھ دوڑی' اور آپ کو کس نے اجازت دی اس کمرے میں آنے کی۔ پتا ہے یہ آج کل لڑکیوں کا ڈریسنگ اٹیچ چیک روم ہے۔

لو بھلا یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے' روز دیکھتا ہوں جاتی کوئی اور ہیں اور نکلتی کوئی اور ہیں..... وہ دل کھول کر ہنسا۔

میری پنیں دیجئے..... رومی چیخی۔

سچ میں تو مذاق کر رہا تھا میں ایسی واہیات چیزیں نہیں دیکھتا میں تو خوش رو کے پاس ایک عدد چائے کے کپ کی درخواست لے کر حاضر ہوا تھا۔

دماغ ٹھیک ہے تمہارا..... مہندی لے کر آتے ہی ہوں گے وہ لوگ..... یہ بدعت نہیں چلے گی' تمہیں دیکھ کر سب کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس آجائے گی' کسی کو یاد آئے گا کہ اس نے گزشتہ تین گھنٹوں سے چائے کی صورت تو درکنار اس کی خوشبو بھی نہیں سونگھی کسی کو یاد آئے گا کہ وہ صبح اپنی چائے کی پیالی ناشتے کی میز پر ہی بھول گیا تھا۔

معاف کرو بابا..... اس نے ہاتھ جوڑ کر اپنے ماتھے سے ٹکائے' اور سنو یہ ٹائی کی ناٹ کیا سلام پھیر رہی ہے؟ اس نے جاتے ہوئے شاہ زمان کی ٹائی کھینچی' سوٹ پہن لیتے ہو۔ آداب بھی ملحوظ رکھا کرو اس نے ناٹ درست کی..... بے ڈھنگے ایک تو میں تم سے تنگ آیا نماز پڑھ کر دعا کی بجائے شکوہ کرتا ہوں کہ خدایا کیا خوش رو میرے بعد نہیں بھیجی جاسکتی تھیں عاجز ہوں میں اس دو سالہ

سنیارٹی سے وہ تھوڑا سا جھک کر مسکرایا۔

بے کار باتیں مت کیا کرو تم نے کبھی بھولے سے بھی میرا احترام کیا ہے؟ یہ میں ہی ہوں جو یہ بے ادبی برداشت کرلیتی ہوں..... چھوٹتے ہی نام لیتے ہو۔

اب ماموں جان نے اپنی اکلوتی صاحبزادی کا نام ہی اتنا خوبصورت رکھا ہے۔ خوش رو ہزار تسبیح پر بھی پڑھو تو بور نہ ہو۔ وہ شرارت سے بولا آس پاس کھڑی تمام لڑکیاں خوش رو سمیت بے ساختہ ہنس پڑیں۔ بہت بدتمیز ہے یہ شاہ..... کئی آوازیں ابھری تھیں۔.....

چھوٹی پھوپھو..... کیا گھر میں کوئی نہیں ہے وہ کاریڈور سے ہی شور مچاتی چلی آئی تھی۔

سب ہیں بیٹی' کہاں جائیں گے بھلا

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام..... یونیورسٹی سے آرہی ہو.....؟۔"

"جی..... ڈائرکٹ..... یہ شاہ کا بچہ کہاں ہے' کل اس کا رزلٹ آیا تھا اس نے بتایا بھی نہیں۔"

چھوٹی پھوپھو ایک دم خاموش ہوگئیں۔

اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ گویا گڑبڑ ہوگئی۔ ورگرنہ پھوپھو کے تاثرات اس وقت اور ہی ہوتے۔

"کیا ہوا پھوپھو.....؟۔"

"رہ گیا ہے.....۔" وہ سخت رنجیدہ ہوگئیں۔

"اوہ..... خوش رو کو بھی دھچکہ لگا ہے کہاں.....؟۔"

"اپنے کمرے میں.....۔" وہ آہستگی سے بولیں۔

"ذرا میں اس سے مل لوں۔" وہ اٹھ کر شاہ کے کمرے میں آگئی۔

"اے مسٹر..... یہ کیا اٹھوائی اور کھٹوائی لئے پڑے ہو' اندھیرا کیوں کررکھا ہے..... کیا رو رہے ہو؟۔"

"طعنے مارنے آئی ہو تو فوراً" چلی جاؤ۔" وہ اسی طرح اوندھا لیٹا رہا۔

"ارے..... کینہ پرور نہیں ہیں جو تم نے کیا بھلا دیا..... اٹھو..... اس طرح کیوں لیٹے ہو' اس نے

اس کی پشت پر ہاتھ مارا تو وہ سیدھا ہوگیا۔"

اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔

ارے بالکل ہی مجنوں بنے ہوئے ہو' اچھے مرد ہو وہ اس کے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔

ناکامی..... کامیابی کی اہمیت دوچند کرنے آتی ہے..... ناکام بھی انسان ہی ہوتے ہیں' کہاں ہے وہ مردوں والا حوصلہ اتنی اتنی سی بات پر دل برداشتہ ہوتے ہو۔ یقین نہیں آتا کہ اس پہلوانوں جیسے جسم میں چڑیا جتنا دل ہے۔ ایمان سے شاہ تم سے تو اس پست حوصلگی کی امید نہیں کی جاسکتی تم نے کرنا ہی کیا ہے۔ شاہ زمان لغاری..... کھانا پینا سونا اور امتحان دینا۔

میں کم ہمت نہیں ہوں خوش رو..... خوف اس بات کا ہے جتنی جلدی کررہا ہوں اتنی دیر ہورہی ہے کہیں امتحانوں میں ٹارگٹ ہی گم نہ ہوجائے۔ اس نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

ٹارگٹ نہ ہوا چھلاوا ہوگیا مجھے بتاؤ..... باندھ کر تمہارے سامنے بٹھادیتی ہوں ابھی وہ ہنسی..... بے ایمان نیت صاف منزل آسان..... کہیں گم نہیں ہوتا ٹارگٹ خوش رو

"ہوں.....؟۔"

"ابھی میں واقعی بہت اداس تھا' بہار کا پہلا جھونکا بن کر آئی ہو۔"

اچھا شاعری ہورہی ہے خیر اڑھائی دن تو سقے نے بھی بادشاہت کی ہے تم بھی ایک دن کے شاعر ہوئے تو کوئی مضائقہ نہیں....." وہ پھر مدھر ہنسی ہنسی۔

"پہلی ناکامی سے گھبرا گئے..... ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟۔"

"تم پھر عمر بیچ میں لے آئیں.....۔" وہ جھلایا۔

"اے بداخلاق نوجوان..... بعض اوقات نیکیاں بھی کامیابی سے ہمکنار کردیتی ہیں مہمان کا اٹھ کر استقبال کرنا بھی میرے نزدیک نیکی ہے۔ اس نے فلسفہ بگھارا۔"

وہ ہنستا ہوا اٹھ بیٹھا۔

اٹھو شاباش شیو بناؤ غسل کرکے اچھی سی ڈریسنگ کرو' اور مجھے دکھاؤ تاکہ میں خوش ہوں میں دیکھتی ہوں پھوپھو نے دوپہر کے کھانے کے لئے کیا انتظام کیا ہے جلدی کرو..... پھر کھانا کھائیں گے

وہ فوراً" ہی باہر نکل آئی۔

کچن میں پہنچی تو پھوپھو کھانا گرم کر رہی تھیں۔

کیا کہہ رہا ہے.... کل شام سے بھوکا ہے' زبردستی صبح ایک بوائل انڈا کھلایا تھا باپ اتنے سخت ہیں لیکن انہوں نے بھی کچھ نہیں کہا پھر بھی....

آ رہا ہے نہا دھو کر.... دراصل وہ ناکامی کا عادی نہیں ہے۔ پہلا دھچکہ تھا اس لئے بہت محسوس کیا ہے' خیر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ارے کیا ٹھیک ہو جائے گا۔ ہر وقت کے کھیل تماشے تو یہی رنگ لائیں گے۔ ہم تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے.... وہ آزردگی سے بولیں۔

بس یہی بات غلط ہے پھوپھو آپ لوگ اگر اس کی ناکامی کا بار بار احساس دلائیں گے تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ کیا اس سے پہلے ایسا کبھی ہوا' اس کی ہمت بڑھایئے اسے توڑیئے مت.... کھیل تماشے تو اس کے ہمیشہ ہی سے ہیں پھر بھی وہ کامیاب ہوتا رہا ہے بس آئندہ تذکرہ مت کیجئے گا.... انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کتنے ہی دن گزر گئے وہ اپنے ایم اے کے امتحانوں میں مصروفیت کے سبب کہیں آ جا نہ سکی۔

بقول شاہ کے تم سمیسٹر دیتی یا اعتکاف میں بیٹھ جاتی ہو۔ ترس جاتے ہیں تمہارے "خوش رو" کو رات کو بہت دیر تک جاگتی تھی اس لئے ناشتا کر کے پھر سو گئی تھی۔ ظہر کے وقت اٹھی تو امی نے بتایا کہ شاہ زمان آیا تھا میں نے کہہ دیا کہ تم سو رہی ہو۔ رات پھر جاگی ہو تو اس نے اٹھانے سے منع کر دیا۔

اسے شاہ زمان کی حساسیت پر بڑا شفیق سا پیار آ گیا۔

کھانا کھا کر نہیں گیا امی؟

نہیں کہہ رہا تھا کہ سعدیہ (بڑی پھوپھو کی لڑکی) کو لینے جا رہا ہوں امی نے بلوایا ہے ان کی طبعیت ٹھیک نہیں ہے میں شام کو دیکھنے جاؤں گی تم چلو گی؟"

کل میرا آخری پیپر ہے امی.... واپسی پر چلی جاؤں گی آپ چلی جائیں۔

اگلے روز وہ پھوپھو کے گھر پہنچی ابھی راہداری بھی پار نہیں کی تھی کہ پھوپھا جان کی گرجتی ہوئی آواز آئی' جانے کن شوہدوں میں بیٹھنے لگا ہے۔ جب ہی پڑھائی میں کورا ہو رہا ہے۔ یہ عمر ہے ان حرکتوں کی۔ صاحبزادے تین میں نہ تیرہ میں بیچنے کھڑے ہو تو کوئی مفت نہ لے۔ یہ سب تمہارے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔ ایک ہی بچہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اسے لاڈ پیار سے ناکارہ کر دیا جائے.... میں کہہ رہا ہوں ابھی بھی آنکھیں کھول لو روؤ گی ورنہ سر پکڑ کر۔

ہو جاتی ہیں بچوں سے غلطیاں' آئندہ نہیں ہئے گا..... پھوپھی کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

خوش رو کا دل کانپ کر رہ گیا.... کیا پینے لگا ہے؟

پوری ڈبیہ خالی ہے.... صاحبزادے سگریٹ کے عادی ہو چلے ہیں.... ایک اطمینان کی سانس خوش رو کے سینے سے خارج ہوئی وہ ہچکچاتی ہوئی پردہ اٹھا کر اندر چلی گئی۔

السلام علیکم

"وعلیکم السلام.... دونوں میاں بیوی اپنے موڈ پر قابو پا کر بولے... کیسی طبیعت ہے پھوپھو آپ کی....؟۔"

اب تو کچھ ٹھیک ہے.... یونیورسٹی سے آ رہی ہو' پیپر کیسا ہوا....؟ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ٹھیک ہی ہو گیا.... اس نے تھکے ہوئے انداز میں صوفے کی پشت سے ٹک کر کہا۔

"خوش رو کا پیپر اور صرف ٹھیک..... ہماری بیٹی کا پیپر بیسٹ ہوتا ہے ٹھیک نہیں" پھوپھا جان نے قدرے تفاخر سے کہا' پھر بولے.... "کاش ایسے ہی شوقین لڑکے بھی ہوں پڑھنے لکھنے کے تو کیا بات ہے" ان کے لہجے میں محرومی بول رہی تھی۔

وہ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے پھر حسب سابق خوش رو اس کے کمرے میں چلی آئی.... وہ صرف جینز ہی پہنے ہوئے اوندھا لیٹا تھا۔ اس کے مضبوط و جوان جسم کو اس حالت میں دیکھ کر خوش رو ایک دم جھینپ سی گئی۔ اسے بغیر دستک دیئے کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ لاکھ وہ اس سے چھوٹا سہی لیکن اب تو ماشاء اللہ جوان ہے مگر اب تو آ ہی چکی تھی وہ بھی سیدھا ہو کر جسم

پر گاؤن لپیٹنے لگا تھا۔ اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ گاؤن لپیٹ کر اس نے تکیئے کے نیچے سے سگریٹ اور لائیٹر نکالا ..... وہ ہکا بکا کھڑی دیکھتی رہ گئی' باپ کی اتنی گرج چمک کے باوجود بڑی لاپرواہی سے سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔

"یہ کیا ہے شاہ.....؟" وہ الجھی

"اسے سگریٹ کہتے ہیں ..... غیر ملکی برانڈ ہے" اس نے سارا دھواں خوش رو کے منہ پر چھوڑ دیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے' خوش رو کو واقعی غصہ آگیا.... اسے دھواں کہتے ہیں بدتمیزی نہیں'۔"

شاہ.... واقعی تم بہت بگڑ گئے ہو..... خوش رو کیا میں بچہ ہوں'؟ وہ یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔

"ہاں.... وہ قطعیت سے بولی۔"

"تم تو کم از کم نہ کہو' بچپن کی بھی حد ہوتی ہے۔" وہ جھلایا۔

"ایسی کیا افتاد آن پڑی ہے جو ابھی سے سگریٹ بھی پینے لگے ہو.....؟"

"لڑکیاں کہتی ہیں سگریٹ پیتا ہوا بہت ہینڈسم لگتا ہوں" وہ شرارت سے مسکرایا.... "ہونہہ لڑکیاں کہتی ہیں .... اور جب کھوں کھوں کرو گے تو یہی لڑکیاں ناک پر رومال رکھ کر بات کریں گی' سمجھے' .... مگر اس وقت تک کافی انجوائے منٹ تو ہو چکی ہوگی" وہ حلق پھاڑ کر ہنسا۔

"کہیں ڈوب مرو جا کر چلو بھر پانی میں....." وہ آگ بگولا ہو گئی۔

عورت کی تقدیس.... سخت نابلد ہو تم اس سے..... جوان مرد کی شان اس میں نہیں کہ وہ پھل کو چکھ کر دیکھے' مردانگی تو یہ ہے کہ انجوائے منٹ کے ایسے لمحوں پر حقارت سے تھوک کر لعنت بھیجے خدا نے تمہیں مرد بنایا ہے مردوں کی سی آن بان بھی پیدا کرو' مرد کے ساتھ اس کی "جیت" نہ ہو تو وہ بھی کوئی مرد ہے کبھی نفس کو چاروں شانے چت گراؤ تو بات ہے"

ایک تو میں تمہاری TEACHING سے بہت عاجز ہوں وہ واقعی عاجز آکر بولا .... یہ TEACHING نہیں ہے' دوستانہ سی بات ہے غور کرو.... پسند آئے تو.... کرو ورنہ.... وہ اس کی طرف دیکھتا رہا.... کافی دیر تک.....

بات تم بھی تو کہتی ہو خوش رو.... دل کو لگتی ہے..... مگر باقی دوسرے تو مجھے گنہگار ثابت کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ذرا سی بات پر اتنی انسلٹ کرتے ہیں کہ خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے یار.... ان لوگوں کی عمریں گزر گئیں' انہیں بات کرنا نہیں آتی تعجب ہے' خوش رو نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اپنی اپنی سمجھ ہے شاہ.... ذرا ذرا سی بات کا برا مناتے.... بے وقوفی کی نشانی ہوتی ہے۔ ضد سے انسان خود ہی تباہ ہو جاتا ہے' اہم بات یہ ہے شاہ کہ دکھ نہیں دیتے۔ جوابی دکھ پھر ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں' گندم بو کر کسی نے چنا بھی پایا ہے یا چنا بو کر کبھی گندم بھی کاٹی گئی ہے' خود کو تباہ نہ کرو شاہ.... وقتی طور پر برہم ہونے والے یہ سب لوگ تمہارے سب سے زیادہ ہیں۔ یہ تمہیں بہت شدت سے سوچتے ہیں۔ انہیں دکھ نہ دو شاہ... میں انہیں کیا کہتا ہوں خوش رو..... یہ مجھے ضد کیوں دلاتے ہیں"

پندرہ دن پیشتر چھوٹے ماموں کے ساتھ ہنسی مذاق میں سگریٹ کا ایک کش لے لیا تھا بابا نے مجھے ضروری کام سے اپنے کمرے میں بلایا میں گیا تو کہنے لگے۔ سگریٹ پی ہے؟

میں نے کہا چھوٹے ماموں کے ساتھ ہنسی مذاق میں کش لیا تھا کہنے لگے جھوٹ بولتے ہو اتنا گرجے اتنا گرجے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ یاسر اور اویس ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے بابا نے ان کے سامنے میری اس قدر انسلٹ کی میں تمہیں بتا نہیں سکتا' بس مجھے بھی غصہ آگیا اس دن سے باقاعدہ سگریٹ پی رہا ہوں۔ سگریٹ تک بات نہیں کی' انہوں نے بلکہ یہ بھی کہا کہ میں آوارہ ہو گیا ہوں' لڑکیوں میں گھیرا رہتا ہوں' ارے حد ہوتی ہے اس نے سر جھٹکا۔

انہوں نے میرا جیب خرچ بند کر دیا۔ میں نے کار کے وہیل کیپ بیچ دیئے' پھوپھا کو میں نے بتا دیا کہ سگریٹ کے لئے پیسے چاہیئں تھے۔ اسی لئے ابھی اس قدر گرم ہو رہے تھے وہ آرام سے بولا خوش رو نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"اوہ میرے خدا.... شاہ کے بچے.... تمہیں پھوپھا جان کے غصے سے ڈر نہیں لگا۔ اگر وہ تمہاری ان ضدوں سے عاجز آکر عاق کر دیں تو؟"

"تو کیا.....؟ بھیک مانگنا شروع کروں گا وہ بھی ان کے دوستوں کے محلے..... میں..... نام تو انہی کا روشن ہوگا وہ زہریلی ہنسی ہنسا...... خوش رو اٹھ کر باہر آگئی پھوپھو برآمدے میں بیٹھی مٹر چھیل رہی تھیں۔

"پھوپھا جان کہاں ہیں؟۔"

اپنے کمرے میں ہیں شاید سوگئے ہوں وہ روہانسی ہو رہی تھیں۔

خوش رو پھوپھا جان کے کمرے میں چلی آئی..... "میں آسکتی ہوں پھوپھا جان؟" وہ دستک دے کر بولی۔

"آجاؤ بیٹی.....۔" ان کی آواز بوجھل تھی۔

"سو رہے ہیں.....؟۔"

"ارے نہیں... اب سونا کہاں عمر بھر کا رونا ہے' وہ سرد آہ کھینچ کر بولے..... پھوپھا جان ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے.....؟۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی... "کہو..... لیکن اس بدبخت کی وکالت نہ کرنا....." وہ ناراضگی سے بولے۔

"ارے نہیں' بس آپ میری بات سن لیجئے۔"

"ہوں.....؟۔"

"پھوپھا جان..... ہمارے مسائل اس لئے اور زیادہ الجھ جاتے ہیں کہ ہم باہمی اعتماد کی فضاء قائم کرنے کی بجائے ایک دوسرے کو لعن طعن کرنے لگ جاتے ہیں..... ہمیں اپنے گھروں میں گھٹی ہوئی زندگیوں کے مدفن نہیں بنانے ہیں کہ آخر ہم لوگ پڑھے لکھے ذی ہوش ہیں۔ بعض اوقات حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے جو ہم سمجھتے ہیں..... پھر اس نے شاہ زمان کی کہی ایک ایک بات پھوپھا جان کے سامنے دہرا دی..... پھوپھا جان یہ حقیقت ہے کہ شاہ زمان مجھ سے کوئی بات کبھی نہیں چھپاتا..... پھوپھا جان فاصلے کم کرکے پرانے زمانے کے پرہیبت باپ کے بت کو توڑ کر اس سے دوستوں کی طرح پیش آیئے' یقین کیجئے وہ آپ کی آن بان کو چار چاند لگا دے گا..... وہ بڑا خود پسند سا ہے عقل آنے پر بدل جائے گا آپ اس کے پندار کا احترام کیجئے یقین کیجئے غیر معمولی ذہین ہے"

مایوس نہیں کرے گا آپ کو..... اگر اس کے الٹ ہوا تو میں ذمہ دار ہوں۔"

پھوپھا جان پر اس کی باتوں اور شاہ زمان نے ان جملوں کا جو خوش رو کی زبانی سنے تھے بے حد اثر ہوا..... وہ خاموش ہوگئے تھے۔ شاید انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا.....وہ پھر کچھ نہیں بولی بلکہ موضوع بدل کر بات کرنے لگی مثلاً "انہوں نے نئے سال کی ڈائری کیوں نہیں دی ابھی تک' اور وہ اتنے دن سے گھر کیوں نہیں آئے.....وہ بہت ہشاش بشاش سے اس کے سوالات کا جواب دینے میں مگن ہوگئے تھے۔ اس نے باہر قدموں کی چاپ سنی تو گمان کیا پھوپھو ہوں گی

خوش رو کے رشتے تو اس وقت سے تو آنا شروع ہوگئے تھے جب وہ اسکول میں تھی لیکن اب ان میں سنجیدگی کے ساتھ دلچسپی لی جانے لگی تھی۔

آخر ایک رشتہ سب کو بے حد پسند آگیا لڑکا ایک اعلیٰ عہدے دار تھا خاندان کا تھا کہ ان کے ہاں ابھی تک لڑکیاں غیر خاندان میں نہیں دی جاتی تھیں۔

خوش رو کے والد نے آج اسی سلسلے میں اپنے بہن بھائیوں کا اجلاس طلب کیا تھا۔ خوش رو ایک حقیقت پسند لڑکی تھی۔ اس کی خاندانی اور تعلیمی زندگی اس قدر بھرپور گزری تھی کہ اس نے کبھی آئیڈیل وغیرہ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے جو اسے بے پناہ چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے سوچیں گے بہتر ہی سوچیں گے اس لئے وہ بے حد مطمئن تھی۔ اجلاس رات گئے تک جاری رہا۔ اور اس دوران وہ اپنی کزنز کی چھیڑ چھاڑ کی زد میں رہی.....

ارے خوش رو' ہم تو وقار بھائی اور شاہ زمان کی مونچھوں کی نشوونما پر تشویش کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اور تمہارے "ان" کی مونچھیں تو ان دونوں کی مونچھوں سے بھی سینئر ہیں۔ اس کی چچا زاد حمیرا نے اسے خبر بہم پہنچائی۔

ارے تو کیا خوش رو آپی نے انہیں دیکھا نہیں ہے جو اس طرح بتا رہی ہو؟ فرحی نے حمیرا کو ٹوکا..... ارے تو فکر کی کیا بات ہے..... ترکیب تمہیں ہم بتا رہے ہیں' ایک گول پیالہ لینا اور انہیں پانی پینے کا حکم دینا جتنی مونچھیں بھیگ جائیں اپنے دست مبارک سے کاٹ دینا۔ مونچھیں نارمل ہوجائیں گی' چھوٹے چچا کی عائشہ نے ترکیب بتائی

واہ واہ..... کیا وزیر با تدبیر ہے ہماری عائشہ' سب نے تالیاں پیٹیں تو خوش رو نے ہنسی سے بے حال ہوتے ہوئے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا.... سب لوگ رات کا کھانا کھا کر تقریباً" نو بجے رخصت ہوگئے' رشتے کی حمایت میں ووٹ دے کر وہ کام کاج سے شل ہو کر بستر پر بدن ڈھیلا چھوڑ کر دراز ہوگئی تھی۔

"معا" دروازے کا پردہ آہستگی سے اٹھا شاہ زمان اندر داخل ہوا..... آداب عرض ہے....۔" وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا.... "ہم بھی جواباً" تسلیم عرض کرتے ہیں..... وہ اسی طرح لیٹے لیٹے مسکرا کر بولی..... ہوں..... بہت خوش نظر آرہی ہو..... وہ پاؤں پھیلا کر مزید آرام سے بیٹھ گیا۔

جی ہاں.... اس لئے کہ سنا ہے تم میری بارات کے استقبال کے چیف ہو گے اور شامیانے کے کھونٹے گاڑنے کا مبارک فریضہ بھی تم ہی اپنے مبارک ہاتھوں سے انجام دو گے..... وہ اپنی بات کے اختتام پر خود ہی ہنس پڑی..... شامیانے کے کھونٹے گاڑنے کا نہیں اکھاڑنے کا سنا ہوگا.... وہ سنجیدگی سے گویا ہوا وہ اس کے انداز پر ذرا چونک گئی' ارے اس قدر اداس ہونے کی کیا بات ہے .... تمہاری باری بھی انشاء اللہ جلد ہی آجائے گی۔

"کیا ہماری باری ایک دن نہیں لگ سکتی...." اس کی آواز آہستہ تھی۔

"لگ سکتی ہے لڑکی پسند کر کے بزرگوں سے منظوری لے لو...." وہ مسکرائی "میں چاہتا ہوں پہلے لڑکی سے رائے لے لوں.... وہ آہستگی سے بولا "ایسا کرلو.... میرے خیال میں یہ زیادہ بہتر ہے" وہ نرمی سے مسکرا رہی تھی۔

پھر کیا خیال ہے تمہارا......؟ وہ اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا! خوش رو کانپ کر رہ گئی' وہ نادان بچی تو نہیں تھی بڑے بڑوں کو ٹیچ کرتی تھی۔ کیا واہیات ہانکنے لگے ہو.... وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"وہ جس کا رشتہ آیا ہے اسے بھی کہا ہے تم نے یہ جملہ.....؟ بلکہ خوش نظر آرہی ہو.... دیکھو شاہ ..... اب تم خاموش ہو جاؤ.... شرم کرو.... رشتوں کا احترام کرنا سیکھو.... احترام ہے تو ہی کہہ رہا ہوں.... بہت بری بات ہے شاہ..... آخر تمہارے ذہن میں یہ احمقانہ بات آئی کیوں..... تمہیں پتا ہے تم مجھ سے تقریباً" دو سال چھوٹے ہو' کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی ذلیل کرنے لگے ہو.... تار تار

آنچل کی آبرو محفوظ کی ہے' احتیاط سے .... مت کرو مجھے اس طرح رسوا..... اس نے ہاتھ جوڑے۔

"ناں.... تو مجھے برائی تو بتاؤ.... کیا ہماری سات پشتوں میں اس سے زیادہ حیرت انگیز باتیں نہیں ہوئیں' کیا دادا جان کی سب سے بڑی بہن خاندان میں جوڑ کا رشتہ نہ ہونے کے باعث ایک گیارہ سال کے لڑکے سے نہیں بیاہی گئیں... جس کو تیار کر کے وہ اسکول بھیجا کرتی تھیں۔ اور ہماری نانی جان کی بڑی خالہ بیوہ ہونے کے بعد اپنے سے دس سال چھوٹے دیور سے نہیں بیاہی گئیں... صدیوں پہلے ہمارے ہاں کی پر بہار سید زادیوں نے قرآن کو گواہ کر کے اپنے والدین کو اپنے حقوق نہیں معاف کئے؟ وہ غیروں میں ہم پلہ لوگوں سے نہیں بیاہی جاسکتی تھیں۔؟ جائیداد بچانے کی خاطر جوان لڑکیوں کی امنگوں کا خون کر دینا... اس سے زیادہ سفاکی ہو سکتی ہے... اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعات کیا ہوں گے'؟ کیا یہ غیر معمولی باتیں نہیں ہیں؟۔"

وہ شاید پوری تیاری سے آیا تھا' وہ گنگ بیٹھی رہ گئی۔ وہ وقت وہ زمانے گزر گئے' نئے دور کی نئی قدریں ہیں' اب اس دقیانوسیت کا پیچھا چھوڑ دو' آخر کار وہ بولی۔

"کیسے چھوڑ دوں....؟ ناممکن ہے۔"

جب میں ہی انکاری ہوں تو تم کیا کر سکتے ہو' خبردار جو تم نے آئندہ یہ بات دہرائی وہ چپل ٹٹول کر پاؤں میں اڑسنے لگی۔

میں.... نے تم سے اچھا کوئی نہیں دیکھا خوش رو...... میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ تم مجھ سے کہیں دور چلی جاؤ.... شاہ زمان اس وقت اسے ایک معصوم سا بچہ لگا' اس نے خود پر قابو پالیا اور بولی.... یہ جذباتیت ہے.... ہم تمہاری بیوی اتنی اچھی لائیں گے کہ تم بے اختیار ہمارا شکریہ ادا کرو گے...."

کہاں سے آئے گی میری بیوی؟ اسی خاندان سے .... اس خاندان کی سب لڑکیوں کو جانتا ہوں.... کوئی بھی تم سے اچھی نہیں ہے"۔

اچھا جاؤ فی الوقت یہ موضوع ختم کرو' میں تمہارے لئے کافی بنا کر لاتی ہوں اس نے دانشمندی سے اس پر قابو پانے کی کوشش کی مجھے حوصلہ افزاء خبر سنا کر رخصت کرو خوش رو... میں کافی نہیں

پہنوں گا' وہ اٹھ کھڑا ہوا عین اس کے مقابل... وہ اس سے تقریباً" دو ہاتھ اونچا تھا سیاہ شلوار قمیض میں اس کا سراپا مزید مضبوط و توانا ظاہر تھا خوش رو کو اس کا قرب پہلی مرتبہ کھلا..... اس کا جی چاہا وہ اسے دونوں ہاتھوں سے دھکیل کر بھاگ جائے۔

شاہ عقل کے ناخن لو... ایک دن خود ہی جذباتیت پر پشیمان ہو سکے مجھے علیحدہ تباہ کرو گے۔

خوش رو..... تمہیں ہمیشہ کی طرح صرف باتیں سوجھ رہی ہیں جو مجھ پر گزر رہی ہے تم تمام تر عقلمندیوں کے ساتھ اس کی تہہ میں اترنے سے قاصر ہو خوش رو..... خدا کرے تم بھی کبھی اس امتحان سے گزرو..... پھر تم میری آج کی حالت کا احساس کر کے بہت روؤ گی۔ میری جان پہ بنی ہوئی ہے تمہیں کافی سوجھ رہی ہے' وہ جھٹکے سے پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

وہ ششدر کھڑی رہ گئی... ایک دم خالی الذہن' اسے اپنی دوست صبا کی بات یاد آئی

"خوش رو..... تم اس قدر "خوش رو" ہو کمال کی بات ہے کسی نے تم پر مرمٹنے کی کوشش نہیں کی۔"

اور اس بے حد عملی سی لڑکی نے بھی حیرانی سے سوچا تھا وہ اس قدر غیر جذباتی کیوں ہے؟ اسے نہیں معلوم تھا' کوئی اسے چاہ نہیں رہا پرستش کر رہا ہے۔

کس قدر احمق ہے یہ شاہ بھلا کوئی تک ہے جی میں آ رہا ہے پھوپھا جان کی زبردست جھاڑ پلواؤں' ٹھیک ہے کسی زمانے میں ہمارے خاندان میں یہ سب ہوا جس کا ذکر شاہ کر رہا تھا مگر اب تو سارا خاندان شہروں میں آباد ہو چکا ہے۔ نئی تہذیب اور قدروں کو جو عقل سے ہم آہنگ ہیں اپنا چکا ہے۔

میں حیران تو رہی تھی کہ یہ شاہ ایک دم سے اتنا بڑا بڑا سا کیوں لگنے لگا ہے اور "آپ" کے بجائے "تم" سے کلام کرنے لگا ہے' پرلے درجے کا احمق..... وہ دوبارہ بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

✲...✹...✿

پھر اس نے اتنی بری خبریں تواتر سے سنیں کہ اس کا دل بیٹھ گیا۔

شاہ اپنے ماں باپ سے الجھ پڑا.... شاہ نے خواب آور گولیاں نگل کر خودکشی کی کوشش کی... آگ اس کے گھر تک پھیل گئی تھی' خدا کا کرم تھا کہ سب کو خوش رو پر پکا اعتماد تھا سب اسی کو احمق گردان رہے تھے۔ خوش رو کو تو سب کے سامنے جاتے ہوئے بھی شرم آنے لگی۔ پھر اس نے سنا..... "پھوپھا جان نے شاہ زمان کو عاق کر دیا ہے.... اپنے لخت جگر شاہ زمان کو"

"اپنی عمر بھر کی کمائی... اپنے بڑھاپے کے مان کو.... اپنی واحد اکلوتی نرینہ اولاد کو...."

اس نے یہ بھی سنا کہ پھوپھو نے کہا تھا اگر وہ شاہ زمان کی ضد مان بھی لیں تو کیا خوش رو اور اس کے والدین اس احمقانہ فیصلے سے اتفاق کریں گے؟ آخر خوش رو بھی تو اپنے والدین کی واحد اولاد ہے۔

اب سب کچھ ناقابل برداشت ہو گیا تھا اور "عاق" کا سن کر تو خوش رو کا احساس دل تڑپ تڑپ گیا خدا معلوم کہاں کہاں ٹھوکریں کھائے گا۔ اس قدر نازوں کا پالا..... اس کی خاطر.....

وہ اپنی ماں کو بتا کر پھوپھو کے ہاں چلی آئی۔ اور پھوپھو سے کہا وہ اسے ایک بار پھر سمجھانے آئی ہے پھوپھو رو پڑیں کہ تمہارے پھوپھا یہ کہہ گئے ہیں اس کے پاس شام سات بجے کا وقت ہے وہ سات بجے تک گھر چھوڑ دے۔

وہ فوراً" اس کے کمرے میں چلی آئی.... وہ ایزی چیئر پر نیم دراز اخبار دیکھ رہا تھا شیو بڑھی ہوئی ستا ہوا چہرا' اسے دیکھ کر چونک اٹھا پھر واپس نظریں موڑ کر لاتعلقی کا اظہار کیا۔

"السلام علیکم۔" وہ بولی۔

"مت بھیجو مجھ پر سلامتی' گوشت کھانے اور سلام کرنے تک مسلمان ہو بس.....؟ وہ باتیں جو ہماری پاکیزہ ہستیوں نے معیوب نہیں سمجھیں تم سب انہیں گناہ قرار دے رہے ہو وہ بگڑا تھا۔

یہ بات نہیں ہے شاہ.... وہ باتیں اس دور کے مطابق بھی معیوب تھیں کہ اس زمانے میں کزنز قطعی نامحرموں کی صف میں تھے۔ ان سے پردہ کیا جاتا تھا آج کے دور میں رشتے دار اگر ایک گھر ایک ہی کنبہ ہوں تو کزنز کو بہن بھائی ہی سمجھا جاتا ہے۔ بالخصوص عمروں کے تفاوت سے انہیں ادب و احترام اور تعظیم کی تلقین کی جاتی ہے۔ چھوٹی عمر کا کزن اپنے بڑوں کو حقیقی بہن بھائیوں کی

طرح سمجھتا ہے کہ ا پن سے رشتے کا احترام بتادیا جاتا ہے۔ اب اگر اس طرح کے قدم اٹھائے جانے لگیں تو کیا یہ بات معاشرے میں بگاڑ پیدا نہیں کرے گی۔ عمروں کے لحاظ' بیچ سے اٹھ جائیں گے تو بتاؤ تہذیب کی یہ شکل باقی رہ سکے گی! خدا کے لئے نادان نہ بنو' ایک سنہرا مستقبل تمہارا منتظر ہے وہ منت سے بولی

مت کرو تقریر' دلیل سے عقل قائل ہوتی ہے عشق نہیں۔ مگر یہ بات تمہیں سمجھ نہیں آئے گی۔ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" وہ اس کی بے باکی کو ہضم نہ کر سکی۔

جس دن تمہیں کوئی لینے آیا تو گولی ماردوں گا اس کے لہجے میں سفاکی اور عزم تھا۔ وہ لرز کر رہ گئی اسے معلوم تھا یہی جملہ اس نے باپ کے سامنے کہا تھا جس کی وجہ سے اسے عاق کر دیا تھا۔

وہ اندر ہی اندر اس کے جذبے کی شدت اور مضبوطی سے خائف سی ہو گئی تھی۔ میں جارہا ہوں خوش رو آج یہ گھر ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر' میں نہیں چاہتا بابا میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگین' یہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی مگر خوش رو..... وہ رک گیا اور اپنے غصے پر قابو پانے لگا۔

مت تباہ کرو خود کو تم مجھے بہت عزیز ہو شاہ مجھے جیتے جی مت مارو..... آنے والے دنوں کا انتظار کرو جو تمہیں عقل و دانش دینے آرہے ہیں وہ پھر ملتجی ہوئی۔

نہیں ہوں میں بے وقوف سمجھیں؟ تم ہو کر تو دیکھو کسی اور کی ..... " وہ اٹھ کر باتھ روم میں بند ہو گیا۔ وہ مردہ قدموں سے پھوپھو کے سامنے چلی آئی۔

پھوپھو..... وہ تباہ ہو رہا ہے۔ بخدا اس میں میرا کوئی قصور نہیں' میں اس کی ضدمان لیتی ہوں آپ دونوں کی خاطر میں اسے پرورش کروں گی۔ میری عمر کار خیر میں گزر جائے گی۔ یہ زندگی کا بہترین مصرف ہوگا۔ میں اس کی زندگی کو کار آمد بنانے کی کوشش کروں گی' آخر وہ ہمارا اپنا ہے..."

پھوپھو آنکھیں پھاڑے خوش رو کو دیکھ رہی تھیں' جو کاٹ کاٹ کر اشک روکنا چاہ رہی تھی۔

زیادہ ہنگامہ نہیں ہوا' خاص خاص عزیزوں کی موجودگی میں نکاح کی رسم انجام پا گئی خوش رو کے پاپا رخصتی میں التواء چاہتے تھے لیکن پھوپھو نے اصرار کیا کہ عمریں گزر گئیں میاں کی سختیاں اور

بیٹے کی لاپرواہی و خود سری جھیلتے' ایک عمر بعد بہار دیکھی ہے۔ وہ اب خوش رو کی جدائی برداشت نہیں کر پائیں گی۔ خوش رو آج بھی ان کی تھی اور کل بھی انہوں نے مزید ردوکد کے رات گیارہ بجے اسے بچوں کی طرح بلک بلک کر رخصت کیا۔

ان کی خاندان بھر میں یکتا والا ثانی بیٹی کسی کی ضد کی بھینٹ چڑھ رہی تھی۔ وہ اس کی خوشیوں کے لئے دعا گو تھے۔ خوش رو کی زندگی کا خوبصورت ترین وقت زندگی کا سب سے الجھا ہوا وقت بن گیا تھا۔ شاہ زمان نے جب کرسی پر نیم دراز سا ہو کر اسے بچوں کے سے انداز میں خوش ہو کر دیکھا تو خوش رو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

خوش رو..... آج ڈیجنگ نہیں ہوگی' آج میں اس کرسی پر بیٹھے بیٹھے یقین کرنا چاہتا ہوں کہ واقعی یہ تم ہو' جذبے جیت جاتے ہیں خوش رو..... وہ فخریہ بولا۔

"ہاں شاہ زمان واقعی جذبے جیتا کرتے ہیں' جیسے رحم کا جذبہ ہمدردی کا جذبہ' تمہارا خدا معلوم کون سا جذبہ ہے' مگر ہاں میرے ہاں محض جذبہ ہمدردی ہے۔"

اس نے پہلی مرتبہ شاہ زمان کو نظر اٹھا کر دیکھا آف وہائیٹ شیروانی اور سفید پاجامے میں وہ خوش رو سے لاکھ گنا خوش آسودہ اور کئی گنا "بڑا" نظر آرہا تھا۔ وہ گھبرا سی گئی۔ وہ ابھی تک اپنے دل میں اپنے مقام کا تعین نہیں کر پائی تھی وہ اسے "پنکج ادھاس" کی غزلیں سنانے لگ گیا۔ اسے ایک ہندوستانی آرٹ فلموں کی اداکارہ بے حد پسند تھی۔ اس کے جمع شدہ کلوز اپ دکھائے' جب خوش رو کو ٹوٹ کر نیند آنے لگی تو وہ لباس تبدیل کرنے چلا گیا خوش رو نے وہیں بیڈ پر گر کر آنکھیں موند لیں' سولی کے انتظار میں نیند نہیں آتی..... مگر سولی پر آجاتی ہے۔

اسے بھی آ گئی تھی۔

صبح جب آنکھ کھلی تو شاہ زمان کمرے میں موجود نہیں تھا۔

پھوپھا جان اور پھوپھی جان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا ان کا بیٹا کس قدر بدل گیا تھا ہر دم اپنے مستقبل کی فکر میں گامزن' خوش رو پھوپھو کے سامنے ہنستی کھلکھلاتی رہتی تھی' مگر تنہائی میں اس کی آنکھیں بھیگی رہتی تھیں۔

خوش رو کی بھرپور لگن آخر رنگ لائی شاہ زمان بار ایٹ لاء کے لئے باہر جا رہا تھا' پھوپھا پھوپھی خوشی سے بے حال تھے ان کے خواب ایک ایک کر کے پورے ہو رہے تھے۔ وہ خوش رو کے بے حد ممنون و مشکور تھے۔ پھوپھو خوش رو کو آنچل پھیلا پھیلا کر دعائیں دیتی تھیں"

شاہ زمان ماں باپ کو اور اسے باقاعدگی سے خطوط لکھتا تھا وہ اس کی بیوی تھی مگر اس کا خط بے حد دوستانہ سا ہوتا تھا ایک جملہ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا خوش رو تم اس قدر اچھی سی ہو اور میری ہو سوچتا ہوں خوش رہتا ہوں۔

وہ جملہ پڑھتی تو دو موٹے موٹے اشک خط پر پھسل پڑتے تھے۔

پہلی عید تھی شادی کے بعد' پچھلی عید کے مہینے میں تو وہ رخصت ہوئی تھی' پہلے اس نے گھر وغیرہ صاف کیا پھر امی کی طرف چلی گئی' وہاں ان کا ہاتھ بٹانے تراویح کے بعد پھوپھا اسے لینے آ گئے۔

رات جب وہ اپنے کمرے کی سیٹنگ بدل رہی تھی تو پھوپھو نے شاہ زمان کا خط لا کر دیا کہ وہ دوپہر کو بھول گئی تھیں۔ اس نے معمول کی نرمی سے خط چاک کیا۔

خوش رو

سلامت رہو

عید آنے والی ہے سوچ رہا ہوں کیا تحفہ بھیجوں'؟ خوش رو تم میری سب سے اہم خوشی بھی تھیں اور امتحان بھی' میں تمہارا شوہر ہوں مگر تمہاری نظر نے کبھی مجھے اس حالت میں قبول نہیں کیا۔

خوش رو میں نے روح و عشق کے تقاضے پورے کئے میری روح خوشی سے سرشار ہو کر میرے نفس کو چت گرا کر اس کی پیٹھ پر تھرکتی رہی۔

مگر یہاں کے آزاد ماحول میں آ کر مجھے محسوس ہوا تم نے مجھے بے حد محروم رکھا ہے کیا تم تھوڑی دیر کے لئے دانا و بینا انٹیلیکچوئل لڑکی سے ایک انجان والہڑ دلہن نہیں بن سکتی تھیں"

تمہاری نظر بڑوں کی نظر کیوں بن جاتی ہے' تم ایک استاد کی طرح مجھے کیوں برداشت کرتی

رہیں' خوش رو' نفس بڑی طاقت ور چیز ہے گر کر بڑی جلدی اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے کچھ زندگی کے فطری تقاضے ہوتے ہیں اور تم ایک بند دروازہ ہو' دستک بھی دینے نہیں دیتیں۔ امکان وجدان کہتا ہے تمہاری نظر ایک دلہن کی نظر نہیں ہو گی محض ایک ٹیچر کی تنبیہہ ہو گی میں تمہاری پرستش ضرور کر سکوں گا چھو نہ سکوں گا' تم ضرورت سے زیادہ بزرگ نہیں ہو گئیں بلکہ از خود بن گئیں خوش رو.....؟

میں نے بہت سے قرض جو میرے وجود کے مجھ پر تھے چکانے کے لئے ایک بے وقوف سی غیر ملکی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ واپسی پر وہ میرے ساتھ ہو گی۔ ہم سب ایک گھر میں رہیں گے یہ احساس کس قدر خوش کن اور باعث طمانیت ہے کہ تم اس قدر اچھی ہو اور میری ہو۔

شاہ زمان!

عجب مرد شاہ زمان' اپنے ہی تقاضے یاد رہے تمہیں' کیسے بہادر ہو دنیا سے جیت سکتے ہو ایک عورت سے نہیں مجھے کس خوشی میں محروم رکھا ہے' اے خود غرض ملکیت پرست اور.... اور "احمق انسان"......وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

......*

سوال

پیریڈ شروع ہوئے دو منٹ تو ہو ہی چکے تھے۔ وہ تیزی سے اپنی کلاس کی طرف بڑھی تھی لیکن یہ دیکھ کر رک گئی کہ جناب اسمٰعیل سرشار ابھی تک اپنے لیکچر ہی میں مگن تھے اس نے ریسٹ واچ پر نظر ڈالی اور ایک طویل سانس لے کر کھڑی ہو گئی اور ان کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

حسرت کی شاعری مکمل طور پر روایت شکن نہیں کہی جا سکتی' ہاں انہوں نے محبوب کے تصور کو کسی حد تک بدل دیا...... اسمٰعیل سرشار کہہ رہے تھے "اب محبوب بالا خانے سے گھر کی ڈیوڑھیوں' والانوں میں اتر آیا تھا......"۔

"بالا خانہ سر۔؟" ایک شوخ آواز ابھری۔

"سر! وہ مولانا تھے...... ایک اور جوشیلے نقاد نے آواز بلند کی۔"

"دیکھیے ادبی تخلیق فطری صلاحیت کا عمل ہے اور اس کی نکاسی نثر کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔ اور نظم کے انداز میں بھی صلاحیت خمیر میں گندھ کر آتی ہے میرے بیٹے اور اسے کوئی بھی ذی روح مذہب کے ادراک سے بھی پہلے محسوس کر سکتا ہے۔ اور مولانا بھی انسان ہی ہوتا ہے۔ اس کے احساسات انسانوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ مذہب پر عمل پیرا ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تمام تر انسانی فطری تقاضوں کو دفن کر دیا جائے بہرحال حسرت نے اپنے خیالات اپنی فکر کے اظہار کے لئے غزل کی راہ اپنائی اور جیسا کہ آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ غزل کے لغوی معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا"۔

"سر! جاوید نے رات دل کھول کر عورتوں سے باتیں کیں"

"ہا...ہا...ہا... پوری کلاس ہنس پڑی۔"

"کیا بدتمیزی ہے! کیا مطلب ہے آپ کا؟" انہوں نے متکلم طالب علم کو گھور کر غصے سے کہا۔

"مم...... مم...... میرا مطلب ہے سر! جاوید کہہ رہا تھا رات انہوں نے دو غزلیں لکھیں طالب علم نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔ اس کی بے ادبی باہر کھڑی مس نازنین حیدر کو سخت گراں گزر رہی تھی۔ وہ ہونٹ کاٹتی دروازے کے عین درمیان آ کھڑی ہوئی"

سرشار نے اس کی طرف دیکھا اور گھڑی پر نظر ڈال کر باہر نکل آئے بہت معذرت خواہانہ انداز میں سوری کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ مس نازنین نے دوپٹہ درست کیا اور کلاس میں داخل ہو گئی پوری کلاس روایتی انداز میں کھڑی ہو گئی۔

"تشریف رکھیئے" اس نے مخصوص انداز میں کہا مگر آج لہجے میں حد درجہ سنجیدگی تھی اس نے پوری کلاس پر ایک نظر دوڑائی۔

"کیا پڑھ رہے تھے آپ لوگ؟" حالانکہ یہ اس کا مقام تھا نہ اخلاقی ذمہ داری کہ کسی دوسرے استاد کے پڑھائے گئے سبق یا دیئے گئے لیکچر کے بارے میں پوچھ گچھ کرے لیکن اب سے کچھ دیر قبل ہونے والی گفتگو کی وجہ سے اس کا دل چاہا کہ تھوڑی برین واشنگ کر ہی دے۔

"حسرت" ایک لڑکی نے آہستگی سے جواب دیا۔

"صرف پڑھا' کسی نتیجے پر بھی پہنچے؟"

جی میڈم..... "کئی آوازیں ابھریں۔

"بھئی جس شخصیت کے بارے میں پڑھ رہے تھے اس سے متعلق آپ کے ذہن میں کوئی واضح خاکہ بھی بنا۔؟" اس نے اپنے مخصوص پروقار انداز میں سب پر نظریں دوڑائیں۔

"میڈم! پہلے تو شعر ہوئے کچھ چکی کی مشقت کے' کچھ عاشق کی شرافت کے یعنی بس دور دور سے دیکھنے کی ہدایت تھی۔ پھر ان کی پیدائش اور ان کے پیدائشی نام کا ذکر ہوا کہ کس نے رکھا تھا۔ ابھی محبوب کو بالا خانے سے اتار کر گھر میں پہنچایا ہی تھا کہ گھنٹی بج گئی" اس پرائیویٹ کالج کے شوق ترین اور امیر ترین طالب علم نے استاد کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔

نازنین نے کڑے تیور سے اس طالب علم کو گھورا جو اب بیٹھ چکا تھا۔ پوری کلاس سر جھکائے مسکرا رہی تھی۔

"حارث احمد!" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"یس میڈم"

"جب آپ کالج میں داخل ہوتے ہیں تو کیا سوچ رہے ہوتے ہیں؟"

"یہی کہ کلاس شروع ہو چکی ہے یا شروع ہونے والی ہے"

"اور جب کلاس میں داخل ہوتے ہیں تو کیا سوچتے ہیں؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"یہی کہ اگر لیکچر شروع ہو چکا ہے تو تھوڑا بہت مس نہ ہو گیا ہو......" وہ مسکرایا۔

"اگر پورا بھی مس ہو جائے تو آپ کو کیا فرق پڑے گا۔؟"

حارث احمد آپ اپنی احمقانہ سی حاضر جوابی پر نازاں 'ایک بے ادب انسان ہیں۔ قطعی احمق اس لئے کہ جو اپنے مخاطب کی صلاحیت وحیثیت سے غافل ہوتا ہے ایک دم بے وقوف ہوتا ہے" اس نے برہمی سے کہا "آپ اپنی برجستگی و حاضر دماغی سے اپنے استاد کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ تو علم کے حوالے سے کیجئے آپ کو شفقت بھری داد ملے گی۔ اگر ایک معلم عرفان ذات کے مراحل طے کرنے کے دوران خاموشی کی زکوۃ آپ کی بد تمیزی پر دیتا ہے تو آپ جیسے کم عمر بچے شاید اسے اپنے معلم کی بے بسی سمجھتے ہیں۔ آپ کی گستاخی و بدتمیزی آپ کے لئے باعث آزار ہو گی۔ صرف اور صرف آپ کے لئے آپ کا مودب ہونا آپ کے لئے فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ آپ طلب علم کی ابتداء میں ہیں اور ہم اس سے ذرا آگے تصنع کے تمام تر مظاہرے ایک طرف رکھ کر استاذ نما طلب علم کی سنیارٹی کا احترام اسی طرح کیجئے جس طرح پر پولیس والے فائنل والوں سے خود کو لاشعوری طور پر پیچھے دیکھتے ہیں" وہ بول رہی تھی اور کلاس دم بخود سن رہی تھی۔

"آپ انکشافات کی عمر میں یں۔ لیکن بہت آگے جا کر بھی آپ کو تعجب ہو گا کہ مرحلے ختم ہونے میں نہیں آ رہے..... انکشافات کا بہاؤ رکنے میں نہیں آ رہا۔"

تمام افعال گزشتہ اور اعمال رفتہ آپ کو بتائیں گے کہ پیچھے گزرنے والا ہر لمحہ ایک تجربے کا زینہ

اور انجان دور تھا۔ آنے والے' شرمندہ کر دینے والے لمحات سے بچنے کیلئے آپ آخر ان لوگوں کی بات پر اعتبار کیوں نہیں کر لیتے جو ان راستوں سے گزر کر آ چکے ہیں۔ اسی مقصد کے لئے یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اور اسی غرض سے آپ کو یہاں بھیجا جاتا ہے۔ زندگی کے تجربات اور لیبارٹری کے تجربات میں بے حد فرق ہے زندگی کے تجربات لاعلمی کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے کا نام ہے اور لیبارٹری کے تجربات' تجربات نہیں بلکہ اعادہ ہوتے ہیں تجربہ تو ایک ہی دفعہ ہوتا ہے اور اسے ہوتا ہے جو اس کا نتیجہ پہلی مرتبہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے پھر اس کے بعد اس کے مقلد ہوتے ہیں تجربہ کار نہیں" وہ ایک لمحے کے لئے رکی کہ شاید کوئی بولے مگر سبھی چپ رہے۔

لاعلمی کے اندھیرے میں ٹھوکریں کیوں کھائیے؟ وقت بچائیے۔ بہت کام ہیں پہلے کام تو یہ کیجئے کہ "احترام آدمیت" سیکھیے۔ حارث احمد! جو انداز آپ نے سرشار صاحب کی کلاس میں اختیار کیا' اس نے مجھے مجبور کیا کہ اس سلسلے میں میں آپ سے یہ سب کہوں یہ میرا فرض ہے۔ عموماً ہمارا معاشرہ عمر کے اس دور میں نوجوانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا پسند کرتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس مقام پر بہت سی بڑی ذمہ داری استاد پر آن پڑتی ہے۔ آئندہ میں یہ بدتمیزی و گستاخی قطعی برداشت نہیں کروں گی۔ سن رہے ہیں آپ؟"۔

"یس میڈم" حارث نے کھسیا کر کام کھجایا۔

"تشریف رکھیے" اس کے لہجے میں نرمی عود آئی۔ اسے حارث کا یہ نادم سا انداز اچھا لگا باہمی دوستی کی یہ فضا بہت خوبصورت ہوتی ہے جب فریقین ایک دوسرے کو اس کے مقام سے پہچانیں اور محسوس کریں خواہ یہ فریقین استاد و شاگرد کے باوقار رشتے کی دوڑ میں کیوں نہ بندھے ہوں۔

اب وہ اپنے لیکچر کی جانب آئی' وہ انگریزی پڑھاتی تھی۔ لہٰذا اب وہ "سولیٹیوری ریپر" کی تنہا لڑکی کا دکھ عام کرنے لگی تھی پوری کلاس ہمہ تن گوش تھی۔

اس نے گیٹ دیکھ لیا تھا۔ دونوں شیطان زمین آسمان ایک کر دینے کے درپے تھے اسے دیکھتے ہی چیخ پڑے۔ "نازو خالہ آ گئیں..... نازو خالہ آ گئیں۔

اتنے پیارے پیارے بھانجوں کی شکل دیکھ کر اس کی تو جیسے تھکن ہی اتر گئی۔

"کون کون آیا ہے؟" وہ پوچھتی ہوئی ان کے ہمراہ گیٹ پار کر گئی۔

"امی میں اور یہ حماد" چار سالہ عماد نے خود سے سال بھر چھوٹے حماد کی جانب اشارہ کیا.....

"پپا نہیں آئے؟" اس نے اشتیاق سے بہنوئی کے بارے میں پوچھا۔

"نہیں" وہ نازو کے جھولتے ہوئے چرمی بیگ پر حملہ آور ہوا۔

"ارے..... رے! یہ کیا ہو رہا ہے عماد!" ثریا آپا نے بیٹے کو فہمائشی انداز میں گھورا' پھر بہن کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

"السلام علیکم آپا" وہ مسکرادی۔

"وعلیکم السلام! کیا حال ہیں ہماری معلمہ کے؟" انہوں نے پیار سے بہن کو دیکھا۔

"آپ کی معلمہ تو نہیں' ہاں بچوں کی معلمہ البتہ بہت اچھی ہیں۔ اور آپ اتنے دن کہاں رہیں" اس نے شکوہ کیا۔

"ارے تمہیں کب سے میری فکر کرنے کی فرصت مل گئی!" انہون نے بھی جواب شکوہ داغ دیا.....

"اچھا طنزمت کریں آپ تو جانتی ہیں کہ کالج کے علاوہ بھی گھر میں کس قدر کام ہوتے ہیں وہ بید کی ایک کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی"

"ارے تمہیں تو شوق ہے بے تکان کام کرنے کا..... اتنا پڑھا لکھا بھی پھر نوکری کی تو ہزار روپے کی جس میں کوئی تحفظ بھی نہیں۔ کسی گورنمنٹ کالج میں اپلائی کرتیں تو بات بھی تھی' ارے حماد گر پڑو گے" بہن کی جھاڑ پونچھ کرتے کرتے انہوں نے کارنس پر چڑھتے صاحبزادے کو بھی روکا۔

"خدایا! یہ بچے ہیں یا مصیبت؟"

ماں کے ٹوکنے پر بھی حماد رکا نہیں تھا بلکہ برابر کارنس پر چڑھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ انہوں نے جھپٹ کر اسے مقابل کیا اور ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

"اوفوہ آپا! جب اس کی کوشش ناکام بنا ہی دی تھی تو تھپڑ مارنے کی کیا تک تھی؟" اس نے ثریا کو ایک طرف کر دیا مبادا حماد کے ایک اور تھپڑ جڑ دیا جائے۔

"بھلا آپا اتنے سے بچوں کو بھی کوئی اس طرح مارا کرتے ہیں" اس نے حماد کو کھینچ کر گود میں بھر لیا "بس اپنے پاس رکھو اپنی یہ نفسیات ان جیسا ایک بھی پالنا پڑ جائے تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ اتنا پٹ کر بھی قابو میں نہیں آتے۔" انہوں نے دانت پیس کر حماد کو دیکھا جو اب خالہ کی گود میں دبکا بیٹھا تھا۔

"باپ کی صورت دیکھتے ہی سانس رک جاتا ہے..... بھیگی بلی بن جاتے ہیں اور میری ناک میں تنکا چلا کر رکھتے ہیں"

انہیں سچ مچ غصہ آگیا تھا۔ درحقیقت وہ بہن سے بڑے موڈ میں باتیں کر رہی تھیں' اس دوران انہوں نے اپنی درجن بھر سونے کی نئی چوڑیوں کی تعریف بھی سننا تھی اور بائیس قیراط کے سونے کی خوبی وقدر کے تذکرے کے ساتھ چوڑیوں کے ڈیزائن پر بھی رائے لینا تھی۔ مگر بھلا ہو حماد کا سارا پروگرام گڈمڈ کر کے رکھ دیا تھا۔

اسی وقت امی آگئیں جو غالباً کچن سے نکل کر آئی تھیں "ارے آگئیں نازو بیٹا' دیر ہوگئی آج تو کچھ"۔

"جی امی کالج ہی سے دیر سے نکلی تھی"

"اچھا تو منہ ہاتھ دھولو' ثریا نے بھی تمہارے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تین بج رہے ہیں بھلا بتاؤ" وہ تین کے ہندسے پر ٹکی سوئی کو تشویش سے دیکھتی ہوئی واپس کچن میں چلی گئیں۔

"دیکھو نازو کل جمعہ اسی لئے آج تمہیں میں لینے آئی ہوں..... کل شام کو واپس آجانا ہر وقت کام..... کام' وقت سے پہلے بوڑھی ہو جاؤ گی۔ آج شام کوئی پکچر دیکھیں گے اچھی سی۔ وی سی آر تو مجھے بور کرتا ہے۔ پکچر ہاؤس کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ تمہاری بوڑھی سوچیں بھی سر منہ لپیٹ کر ایک طرف ہو رہیں گی۔ کچھ دیر کو تمہیں بھی دنیا اچھی لگنے لگے گی۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ اسی لئے خود آئی ہوں کیوں کہ پیغام کو تو تم گھاس نہیں ڈالتیں"

"آپا ایک تو چھٹی ملتی ہے' وہ بھی گھر پر نہ گزاروں؟" وہ ہنس پڑی مگر تھکے تھکے انداز میں.....

"میں تمہیں جنگل میں لئے جا رہی ہوں؟ وہ گھر نہیں ہے؟" ثریا خفگی سے بولیں پھر اسے تھوڑی

دیر بعد تیار ہو جانے کا حکم دے کر ماں کی مدد کرنے کے خیال سے کچن میں چلی گئیں.....

دونوں بچے برآمدے میں "ریسلنگ" میں مصروف ہو چکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چلی آئی اس نے چھٹی کے کئی پروگرام بنائے تھے جو آپا کے حکم کے سامنے خود بخود کینسل ہو چکے تھے۔

آپا اسے لے تو آئی تھیں مگر آتے ہی گھر کے بکھیڑوں میں الجھ گئیں۔ وہ بچوں کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر انگریزی فلم دیکھنے لگی۔ دونوں بچے نہایت شرافت سے اس کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔

"پپا کتنے بجے تک آتے ہیں حماد؟" اس نے استفسار کیا۔

"پتا نہیں" حماد نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹائے بغیر بہت بے نیازی سے جواب دیا اسی وقت آپا لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

"نازو! بھوک لگ رہی ہوگی؟ کھانا لگواؤں"۔

"ایسی خاص بھوک تو نہیں ویسے بھی آج دیر سے کھانا کھایا تھا بھائی صاحب آجائیں تو ساتھ ہی کھالیں گے۔ بچوں کو البتہ کھلا دیں"

"اگر تم" ان "کا انتظار کرنا چاہ رہی ہو تو بے کار ہے ان کا کوئی وقت نہیں ہے بہت زیادہ دیر ہو جائے تو باہر ہی سے کھا کر آتے ہیں۔"۔

کیونکہ وہ کبھی رات کو رکی نہیں تھی ان باتوں سے لاعلم تھی۔ بہن کی بات سن کر اٹھ کھڑی ہوئی

"تو پھر ٹھیک ہے کھالیتے ہیں اور یہ بھائی صاحب اس قدر کام کرتے ہیں؟ آپ انہیں ٹوکتی نہیں؟"۔

کیا کہوں؟ آخر یہ عشق و آرام سب انہی کی محنت کے دم سے ہے" انہوں نے اپنے آراستہ ٹی وی لاؤنج پر نظر ڈال کر کہا اور باہر نکل گئیں' چال میں پہلے سے زیادہ اعتماد تھا جو شاید اس سوچ کا نتیجہ تھا کہ وہ اس خاندان کی سب سے باحیثیت شخصیت ہیں ابھی وہ ڈائننگ ٹیبل کے نزدیک ہی پہنچی تھی۔ کہ پورچ کی سمت کھلنے والے دریچوں کی شیشے گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے جگمگا اٹھے۔

"غالباً" بھائی صاحب آگئے ہیں" اسے بہنوئی سے ملنے کے خیال ہی سے مسرت سی ہوئی اسے

اپنے یہ اکلوتے باوقار بہنوئی بہت اچھے لگتے تھے وہ ان کا احترام بھی بے حد کرتی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ آپا کو اتنا اچھا شریک حیات ملا اور اس وقت ملا جب آپا انتظار کے آخری لمحات سے گزر رہی تھیں اور خاندانی انگشت نمائی کی وجہ سے بے حد تلخ ہو چکی تھیں۔ اسے آپا کی دبی دبی سی آواز سنائی دی "امی کے ہاں گئی تھی آج... نازو کو ساتھ لے کر آئی ہوں کل چھٹی ہے نا اس کی"۔

"اچھا کیا" جواد انٹرپرائزز کے مالک جواد بصیر کی سنجیدہ و خشک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"آپ لباس تبدیل کر کے کھانے کے کمرے میں آجائیں" آپا کی تفاخر سے پر آواز اور مضبوط لہجہ اب خوشامد کے انداز میں تبدیل ہو چکا تھا۔

"میں کھانا کھا چکا ہوں"

"نازو سے نہیں ملیں گے؟"

"ابھی تو وہ کھانا کھا رہی ہوں گی" لہجے میں ہلکی سی نرمی چھلکی۔

"چند لمحوں بعد آپا مسکراتی ہوئی کھانے کے کمرے میں چلی آئیں اور بے بی سیٹ پر بیٹھے ہوئے عماد کے گھٹنوں پر نیپکن پھیلاتے ہوئے گویا ہوئیں "جواد آگئے ہیں' کھانا کھا کر آئے ہیں لہٰذا تم اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ ابھی تو وہ لباس تبدیل کر رہے ہیں پھر تم سے ملنے یہیں آئیں گے"

"آپ نہیں کھائیں گی آپا؟"

"ہاں.....ہاں..... میں بھی کھا رہی ہوں حمی چاند! لو یہ سوپ لو.... یہ میں نے تمہارے لئے بنایا ہے" انہوں نے حماد کو چمکارا جو حال ہی میں ٹائیفائیڈ سے "فارغ" ہوا تھا۔ پھر خود بھی کھانے میں مصروف ہو گئیں۔

"نازو جان! یہ روسٹ بیف لو نا' بہت مزیدار بناتا ہے ہمارا بٹلر۔"

"لے رہی ہوں آپا بڑے پروگرام سے مارنے کا ارادہ ہے..... کھلا کھلا کر ماریں گی تو کوئی مارنے کا ذکر تو نہیں کرے گا۔ البتہ کھلانے کا خوب ذکر ہوگا۔" وہ زچ سی ہو کر ہنس پڑی تھی۔

"کوئی نہیں مرتا کھانے سے تبھی تو یہ حال ہے تمہارا' کام مزدوروں کی طرح کرتی ہو اور کھانا

صرف سونگھتی ہو۔" انہوں نے ایک اور قاب اس کی سمت کھسکائی....

"کیا سونگھا جا رہا ہے؟" جواد بصیر کھانے کے کمرے میں سالی کو شرف ملاقات بخشنے چلے آئے تھے۔

"السلام علیکم بھائی صاحب۔" اس نے احترام سے سلام کیا

"وعلیکم السلام کیا حال ہیں بھئی؟۔"

"الحمدللہ بہت اچھے۔" وہ مسکرا دی۔

"سنا تھا تم نے کوئی پرائیویٹ کالج جوائن کر لیا ہے۔"

"جی ٹھیک سنا ہے آپ نے' وقت کا اچھا سا مصرف بھی تو ہونا چاہیے۔"

"گڈ' کافی دنوں بعد آئیں۔"

"جی' بس وقت ہی نہیں ملتا آپ بھی تو بہت دنوں سے گھر نہیں آئے امی اکثر کہتی رہتی ہیں۔"

"جو مسئلہ تمہارے ساتھ ہے وہی میرے ساتھ بھی ہے۔ یعنی وقت۔" انہوں نے عماد کے رخسار چھو کر جواب دیا "ویسے خالہ جان اور خالو جان ٹھیک ہیں نا؟" انہوں نے ساس سسر کی خیریت دریافت کی' وہ ابھی تک اسی طرح کھڑے کھڑے پر تکلف انداز میں بات چیت کر رہے تھے۔

"اچھا تم لوگ کھانا کھاؤ مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے' باہر سے کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں ڈیلنگ ہے ان کے ساتھ۔"

ثریا کے لئے یہ بہت عزت افزائی کا مقام تھا وہ ان کی بہن سے اخلاق سے مل رہے بلکہ بہت زیادہ اخلاق سے۔

"اوکے۔" انہوں نے باری باری دونوں بیٹوں کے رخسار چھو کر پدری محبت کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

کسی قدر فارمل ہیں یہ بھائی صاحب' اس نے جاتے ہوئے جواد بصیر کی پشت پر نظریں جما کر سوچا۔

رات کو آپا ضروری گھریلو امور سے فارغ ہو کر اس کے پاس چلی آئیں۔ میں تمہیں اس لئے نہیں

لائی تھی کہ تم پڑ کر سو جاؤ" وہ اس کے برابر ڈھے سی گئیں "سوچا تھا ڈھیروں باتیں کریں گے"۔

"اف اللہ! آپا بات یہ ہے کہ میرے تمام حواس خمسہ دن بھر استطاعت سے بڑھ کر کام کرتے ہیں۔ میں انہیں رات کو ممکنہ آرام پہنچانے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ یہ اگلے دن کے لئے پھر "شارپ" ہو جائیں' وہ جو کروٹ بدل کر سونے کی نیت سے لیٹ چکی تھی ان کی طرف مڑ کر تھکے تھکے انداز میں ہنس کر بولی تھی۔

"ارے چھوڑو یہ عالمانہ انداز' سارے خاندان والے کہتے ہیں کہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھی ہو۔ زیادہ ملتی ملاتی نہیں ہو' مت مردہ کرو اپنی روح کو ہنسا کرو" انہوں نے اس کی پیشانی پر جھولنے والی لٹیں محبت سے سمیٹیں۔ "کل پکچر تو دیکھیں گے ہی' لیکن عطیہ کے ہاں بھی چلیں گے۔ بہت دن ہو گئے میرا اس کے ہاں جانا نہیں ہوا سنا ہے اس کے میاں کی ترقی ہو گئی ہے۔ مبارک باد ہی دے آئیں گے۔ سرکاری ملازمت میں ترقی کی حد کہاں تک ہو گی یہی ہو گا کہ سترہ گریڈ سے اٹھارہ گریڈ تک جا پہنچے ہوں گے" ان کے لہجے میں تمسخر تھا وہی تمسخر جو پہلے کبھی تلخی ہوا کرتا تھا اب حالات نے "تلخی رفتہ" کو "تمسخر حاضر" میں بدل دیا تھا۔ حالات شاہ ہوتے ہیں' جب جو چاہیں کر دیں۔

عطیہ کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس نے اپنے دل کے ارمان جو آپا کا دل جلانے سے متعلق تھے پورے کرنے میں کچھ زیادہ ہی عجلت دکھائی تھی' آپا اور عطیہ ایک دوسرے کی پیدائشی حریف رہی تھی۔ نمکین سے چہرے اور تیکھے نقوش والی آپا کو عطیہ پر ہمیشہ برتری حاصل رہی تھی۔ ان پر کیا تمام ہی رشتے دار ہم عمر بہنوں پر فرق یہ تھا کہ اکثریت کو آپا کے گنوں کی پروا نہیں تھی۔ لیکن عطیہ اس دوڑ میں جیتنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ تعلیمی میدان' گھریلو امور و فنون غرض ہر چیز میں ثریا نے حسین و جمیل عطیہ کو مات دی تھی۔

پھر ایک دن یہ ہوا کہ عطیہ نے آپا کو چت کر دیا۔ وہ خاندانی لوگوں کی اکلوتی بہو بن گئی تھی۔ اس کا شوہر کلاس ون آفیسر تھا' پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی ادائیگی کے عوض ایک پرکشش سی تنخواہ اور زندگی کی دوسری سہولتیں حاصل تھیں۔ دیکھنے میں بھی وہ ایک خوبرو مرد تھا پھر عطیہ نے ثریا سے

شعوری و لاشعوری طور پر گن گن کر بدلے لئے کبھی اسے تشویش ہوتی کہ آپا کا رنگ پہلے سے زیادہ کالا ہو گیا ہے کبھی اسے ان کی بڑھتی ہوئی عمر فکر میں مبتلا کر دیتی۔ کبھی اسے ہمدردی ہوتی کہ آخر موٹر میکنک کے گھر والے کیا سوچ کر آپا کا رشتہ لے کر آ گئے تھے اتنی سگھڑ اور لائق فائق لڑکی کے لئے توبہ..... توبہ!

قدرت نے آپا کا صبر خوب آزمایا تھا وہ انتیس برس کی ہو چکی تھیں آپا کے بچپن کا احساس برتری عطیہ نے خجالت میں بدل دیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں لہٰذا ایک دن جب وہ کالج سے پڑھ کر واپس آئی ان دنوں وہ کالج میں پڑھ رہی تھی تو امی نے خوشخبری سنائی کہ آپا کے لئے بہت ہی اچھے گھر سے رشتہ آیا ہے۔ لڑکا بزنس مین ہے تین بہنیں ہیں' جو شادی شدہ ہیں ایک بڑا بھائی ہے جو باہر گیا ہے۔ سیدھے سادھے شریف لوگ ہیں یہ اور بات ہے کہ امی نے انتیس سالہ ثریا کو پچیس سال کا بتایا تھا انہوں نے مان بھی لیا تھا لہٰذا امی کو ان کے سیدھے سادھے ہونے پر اور بھی یقین آ گیا تھا۔

خاندانی لوگ تھے۔ زیادہ چھان پھٹک ضروری نہ سمجھی گئی۔ پندرہ سال کی لڑکی کا رشتہ آئے تو ماں باپ عموماً" بے توجہی کا اظہار کرتے ہیں..... گویا رشتہ لے کر آنے والا رشتہ لے کر نہ آیا ہو محض "کچی بیری" کا نظارہ کرنے آیا ہو اور انہیں اتنی خاصی پرواہ بھی نہیں ہوتی لیکن یہی بیٹی جب انتیس برس کی ہو جائے تو انہیں پہلے سے موجود بیوی پر بھی کوئی خاص اعتراض نہیں ہوتا مگر یہاں تو شکر تھا کہ لڑکا کنوارا تھا۔

لڑکے کی والدہ نے بتایا کہ ان کی خواہش تھی کہ ان کا دوسرا سمدھیانہ بھی پہلے بیٹے کے سسرال کی طرح مختصر ہو۔ لہٰذا انہیں آپ کے کنبے کا "اختصار" بہت پسند آیا ہے۔ درحقیقت یہ بہت مختصر کنبہ تھا' ماں باپ اور صرف دو بیٹیاں' آپ کی تو دنیا بدل گئی۔

اسے یاد تھا جب عطیہ' ثریا آپا کی نسبت طے ہونے کا سن کر مبارک باد دینے اپنے چار بچوں کے ہمراہ آئی تھی۔ تب آپا نے اونچے اونچے قہقہے لگا کر اس کا کلیجہ پھونکا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر آپا کی طرف دیکھا..... جو وارڈ روب میں جانے کیا رکھنے لگی تھیں۔

"اف' کل جمعہ ہے..... آپا مجھے لے کر پھر" بے چاری "عطیہ کے ہاں جائیں گی۔ میں بدھو بنی' دونوں کی گفتگو سے کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ آپا اپنی سنگاپوری کی ساڑیوں کا تذکرہ کریں گی۔ ساتھ میں برطانیہ کی سینڈلوں کا بھی جو ان کے میاں سر پر رکھ یعنی سوٹ کیس میں رکھ لائے تھے۔ جو بعض اوقات سر پر بھی رکھ لیا جاتا ہے۔ پھر وہ بتائیں گی کہ اپنا تیسرا بچہ بھی وہ لندن میں جنم دیں گی تاکہ وہ بیک وقت اور تاحیات برطانیہ و پاکستان کا شہری کہلائے اور رعائتوں' فائدوں کے سمندر میں غوطے لگائے۔ کتنا سمجھاتی ہوں آپا' چھوڑ دیں بے چاری عطیہ باجی کا پیچھا' معاف کر دیں ان کے کردہ و ناکردہ قصور' یہ کینے' یہ جلاپے عطیہ سے زیادہ آپ کو بھڑ بھڑ جلاتے ہیں' اس نے ہمدردانہ انداز میں بہن کی طرف دیکھا جو کھڑکیوں کے پٹ بند کر کے اس کے پاس آ رہی تھیں۔"

چھٹی تو اس کی پرلطف گزر گئی تھی۔ کچھ آپا کی وجہ سے' کچھ ان کے شرارتی سپوتوں کے باعث لیکن کالج کی عمارت میں داخل ہوتے ہی وہ پھر اپنے "اصل" کی جانب متوجہ ہو گئی

معلوم ہوا بی ایس سی سال اول و دوم کے طلبہ و طالبات آج پکنک پر جا رہے تھے اسے یاد آیا کہ اس سے بھی پوچھا گیا تھا کہ آیا وہ پکنک پر جانا پسند کریں گی یا نہیں؟ اس نے ہمیشہ کی طرح انکار کر دیا تھا' کہ دوسری کلاسز کے بھی تو پیریڈ ہوں گے۔ خواہ مخواہ ہرج ہوگا آج اس کے دو پیریڈ فری تھے ایک تو معمول کا دوسرا سال اول (بی ایس سی) کی کلاس کا وہ آفس میں آئی تو اسماعیل سرشار صاحب بیٹھے کاپیاں چیک کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر مسکرائے..... السلام علیکم! مس حیدر"

"وعلیکم السلام۔" اس نے بھی نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور اپنے ہینڈ بیگ میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

"آج غالباً" آپ کا یہ پیریڈ فری ہوگا۔"

"جی ہاں۔" اس نے مختصراً" جواب دیا۔

"یاد آیا مس حیدر' سنا ہے آپ نے سیکنڈ ایئر کے "دادا" حارث احمد کو پرسوں انسان بنانے کی "سعی" کی "اسماعیل سرشار نے اسے بغور دیکھا۔

"وہ تو سب کو کرنا چاہیئے۔" اب وہ بیٹھ چکی تھی "سرشار صاحب! معذرت کے ساتھ عرض کروں گی، ہم اساتذہ کو زیب نہیں دیتا کہ ہم اپنے سٹوڈنٹس کو "دادا" یا آوارہ کے نام سے یاد کریں"

"مس حیدر! آپ کو علم نہیں، اس بچے نے بہت عاجز کر رکھا ہے" سرشار صاحب نے جیب سے رومال نکال کر پیشانی پر چمکتے قطرے صاف کیئے۔"

"ان نوخیز پودوں کی پرواخت ان کے والدین کے بعد ہماری ذمے داری ہے بلاشبہ وہ لڑکا بہت شوخ ہے ایک طرح سے ہماری صلاحیتوں کی آزمائش ہے حسرت سے متعلق اس کے ریمارکس پر مجھے بھی افسوس ہوا تھا لیکن سرشار صاحب، قصوروار یہ بچے نہیں ہیں۔ ان کی ذہنی نشوونما وہ لٹریچر کر رہا ہے جسے وہ لوگ لکھتے ہیں جو ان بچوں سے دگنی عمر گزار چکے ہیں۔ پیٹ کا جہنم ٹھنڈا کرنے کے لئے ان لوگوں کو ان بچوں کی رگوں میں دوڑنے والا تازہ خون چاہیے ان کی نشوونما وہ غیر ملکی فلمیں کر رہی ہیں جن کے "میکرز" نے یا تو بہت بھوک دیکھی یا بالکل نہیں دیکھی حتیٰ کہ محسوس نہیں کی۔ ہم ان کے ہاتھ تو نہیں توڑ سکتے۔ مگر ان کی صلاحیتوں کے مقابل اپنی صلاحیتیں تو کھڑی کر سکتے ہیں۔ جنگ صرف کمزور سے نہیں لڑی جاتی۔ بعض اوقات فریقین دونوں طرف سے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ مگر جیت بہرحال ایک ہی کی ہونا ہوتی ہے۔ معرکے سے پہلے ہی احساس شکست کیوں؟۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن......"

اس نے ان کی بات کاٹی "لیکن سرشار صاحب! یہ بھی شکر کا مقام ہے کہ ہمارے بہت سے بچے بہت زیادہ اچھے ہیں اگر ایک سجدے سے انکار کرتا ہے تو لاکھوں سربسجود ہونے والے بھی ہوتے ہیں۔ ہمیں بہت سے حارث احمد ملیں گے اور ہمیں حارث احمد ایسے بہت سے بچوں کو سنوارنا ہے۔ ایسے نہ کہا کیجیے سرشار صاحب بچوں کو، یہ تو بہت معصوم ہیں۔ اسلاف سے محبت و عقیدت کے ہنر ہم ہی نے انہیں سکھانے ہیں" اس کے لہجے میں اتنی حلاوت و شفقت تھی کہ سرشار صاحب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

پورا کالج مس نازنین حیدر کی قابلیت کا معترف تھا اس کے وقار، رکھ رکھاؤ اور قوت استدلال کے سامنے "اکثر" بے بس ہو جاتے تھے۔

سرشار صاحب ایک آئیڈیل پرست انسان تھے۔ مگر ان کے حصے میں دنیا سے بیزار کام کو بوجھ سمجھنے والی چڑچڑی عورت آئی تھی۔ جو سرشار صاحب کی معقول بات کا جواب بھی اس طرح غرا کر دیتی جیسے وہ ساری دنیا کی نہ سہی، کم از کم سرشار صاحب کے خون کی پیاسی ضرور ہو، اتنے نفیس سے انسان کو مس نازنین حیدر جیسی معقول خاتون سے بات کرنے کا موقع ملتا تو ان کا احساس محرومی دو چند ہو جاتا اپنے گھر کی بدنظمی بیوی کے کڑے تیور، نام نہاد بیماریاں شریر اور گستاخ بچوں کی دھا چوکڑیاں، نہ جانے کیا کیا انہیں شدت سے یاد آنے لگتا، ان کا خیال تھا جس گھر میں مس حیدر جیسی شخصیت ہو، وہاں تو انتشار و جہالت الٹے پاؤں بھاگیں۔

"سرشار صاحب! آپ نے میری کسی بات کا برا تو نہیں منایا؟" اس نے گم صم سے اسمٰعیل سرشار صاحب سے پوچھا۔

"ارے نہیں نہیں مس حیدر! کمال کرتی ہیں آپ۔" وہ الٹے شرمندہ ہو گئے۔

"پتا نہیں سرشار صاحب میں بچوں کے سلسلے میں اس قدر حساس کیوں ہوں؟ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان بچوں کو ایک مہم کی طرح سر کروں اس لئے کہ یہ ہمارے ہاتھ پاؤں کی توانائی اور آزادی و بقا کے ضامن ہیں۔ جب جب ان کے بارے میں سوچتی ہوں تو میرے وجود میں روشنیاں سی پھوٹ پڑتی ہیں۔ ان سے زیادہ اہم چیز کوئی نہیں ہے" اس کے کنوارے سے وجود سے ممتا کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ تخیل کے اس نورانی لمحے کی جھلک اس لمحے کا اعادہ تھا"

کائنات نے "ماں" کے درجے کو انسانی درجات کی معراج بنانے کا سوچا ممتا تو عورت کے خمیر کی سب سے پہلی "تہہ" ہوتی ہے۔

زندگی مخصوص ڈھب سے گزر رہی تھی۔ اس کے والدین کو اب اس کی فکر ہو چلی تھی مناسب رشتے کی تلاش تو خیر بہت عرصے سے جاری تھی مگر اب اس کی تلاش میں تیزی آ گئی تھی۔ وہ ان کی کوششوں سے بے خبر نہیں تھی مگر وہ خاموش تھی اسے اعتماد تھا کہ اس کے والدین اس کے

خیالات و کردار سے آگاہ ہیں۔ وہ یہ سب مدنظر رکھ کر ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔

"ثریا آپا تیسرے بچے کی ڈلیوری کے سلسلے میں لندن جا چکی تھیں۔ کان منتظر رہتے تھے کہ وہاں سے کوئی اطلاع آئے اور ایک دن اطلاع آ گئی کہ نیا آدم کیوں کہ بے روح تھا' اس لئے اپنی ماں کی روح کو بھی ساتھ لے گیا ہے۔"

ان سب پر تو گویا پہاڑ سا ٹوٹا تھا رات کو جنازہ آ گیا تھا نازنین کے تو گویا حواس معطل ہو گئے تھے سوئم کے بعد جب وہ لوگ گھر واپس آئے تو حماد اور عماد کو ہمراہ لے آئے کہ بچے سب سے زیادہ اپنی نانی اور خالہ سے مانوس تھے۔ انہیں ساتھ لانے پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ پھول جیسے بھی اس ناگہانی پر سسم کر رہ گئے تھے۔ گم سم حماد نے کئی بار اس کی تھوڑی چھو کر پوچھا تھا "امی کہاں ہیں نازو خالہ؟" کاش مجھے اس "کہاں" کا ادراک ہوتا' اس نے حماد کو سینے سے لگا لیا۔

اس نے کالج سے چھٹی لے لی تھی۔ زیادہ تر وقت بچوں کو بہلاتے گزرتا تھا۔ امی کو تو گویا یہ صدمہ لے ہی بیٹھا تھا عجیب گم صم سی ہو گئیں تھیں وہ پھریوں بھی ہونے لگا کہ بچے کبھی نانا نانی کے پاس اور کبھی دادا دادی کے پاس رہنے لگے "انسانی رہائش" اب یوں بھی نہیں ہوتی کچھ تو حل چاہیے تھا اس مسئلے کا۔

جب جواد بصیر کی والدہ نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا "میرے بیٹے کا تو گھر برباد ہو گیا اسے تو بیوی لا دوں مگر ان شہزادوں کو ماں کہاں سے لا کر دوں؟"

تب نازو کی ماں قطعی کچھ نہ سمجھیں۔ صرف فریاد کی ایک "لے" لگا کر ان کا یہ جملہ جب انہوں نے کھل کر اپنا مدعا بیان کیا تب وہ گم صم بیٹھی سوچتی رہ گئیں۔ نواسے انہیں بھی بہت پیارے تھے' داماد ان کا بھی من بھایا تھا جو خوش حال تھا جس نے ان کی بیٹی کے قدموں میں دنیا کی نعمتیں بکھیر دی تھیں۔ انہیں سوال ناگوار نہیں گزرا تھا بلکہ انہیں صرف اپنی بیٹی کا خیال تھا جب انہوں نے نازو کے سامنے جواد بصیر کی والدہ کی بات دہرائی تو وہ بے تحاشہ چونک کر رہ گئی۔

"امی! کیا کہہ رہی ہیں' ابھی تو آپا کو مرے ہوئے پورا سال بھی نہیں ہوا اور آپ کو دوسری بیٹی کی خوشیاں سوجھنے لگیں۔"

"یہ تو اجڑوں کو بسانے کی بات ہے بیٹی! خوشیوں کے سوال نہیں ہیں پھول سے معصوم بچے ہیں' ان کا بھی سوچ نازو ہمارا تو سب کچھ اب وہی ہیں۔"

"امی رشتہ مستقل رہے تو اچھا ہوتا ہے پہلے رشتے کے بعد ایک ہی شخص سے دوسرا رشتہ میرا ذہن قبول نہیں کرتا۔" اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

"یہ تو رشتہ ہوتا ہے بیٹی جو دو بولوں کے بعد آپ ہی اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔"

وہ پڑھی لکھی تھی اس کا علم اکسابی تھا۔

ماں بھی پڑھی لکھی تھی مگر اس کا علم تجرباتی تھا۔

پھر اس "پیدائشی ماں" کو بچوں کا مستقبل لمس میسر آ گیا۔ وہ بیگم جواد بصیر کے بچوں کی ماں۔

آپا کے بیڈ روم کا خلا پر کرتے ہوئے اس نے شدت گریہ کے ساتھ سوچا آپا! خدا کی قسم تیرے بچوں کے ٹوٹے پنکھوڑے جوڑنے آئی ہوں یہ اور بات ہے کہ یہ بھید بھی آشکارا ہوا کہ جواد بصیر کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ ثریا یا نازنین تھکے ماندے اعصاب کو تو صرف چراغ خانہ کی روشنی چاہیے تھی چاہے وہ جیسا بھی ہو۔

بظاہر سرد نظر آنے والا آدمی دنیا کے گنے چنے عیش پرستوں میں سے ایک لگا تھا اسے' وہ مسکراتا بھی تھا لیکن اس کی مسکراہٹ کی بھی قیمت تھی وہ اسے خوشی دے دیتی تو وہ مسکرا دیتا تھا۔

مسکرانا تو اس کی سرشت میں تھا وہ بھی بڑی رعونت کے ساتھ سارا سارا دن اس کا کبھی فون بھی نہیں آتا تھا۔ رات کو آمد اچانک ہوتی تھی وہ اس کا کوٹ اتارنے اس کی پشت پر جا کھڑی ہوتی۔ مشام جاں کو معطر کرنے والی مہک اسے حصار میں لے لیتی اس کے چوڑے شانوں پر وہ نظر جما کر رہ جاتی۔

"یہ شانے خدا جانے مزدوری کر کے اتنے مضبوط ہوئے ہیں یا مزدوری پا کر؟ اس کے شکووں کے جواب میں جواد بصیر کا یہی کہنا تھا "مزدوری کرتا ہوں ناز بیگم' اس قدر فارغ نہیں ہوں کہ گھر میں اپاہجوں کی طرح پڑا رہوں میں نے تم پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ تم کالج بھی جاتی ہو اس کے علاوہ بھی آنے جانے کے سلسلے میں آزاد ہو۔ میں اپنی ذاتیات میں دخل در معقولات پسند نہیں

کرتا۔" اس کے بعد اس نے ازلی دانشمندی سے معاملہ سنبھال لیا کبھی جواد بصیر سے شکوہ نہ کیا دکھ تو نظرانداز کئے جانے کا تھا۔ نو بجے تو جواد بصیر گھر آجاتے تھے اس کے بعد بھی وہ گھر کے بائیں جانب بنے آفس میں مصروف ہوجاتے۔

اکثر رات کو جب وہ بچوں کو سلا کر اپنے بیڈ روم میں آتی تو گاڑیوں کے مسلسل ہارن سے اس کے اعصاب شل ہوجاتے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ کون احمق ہیں جو رات کے وقت بھی اس قدر کام کرتے ہیں۔ یہ مسلسل تیسری رات تھی جب جواد بصیر نے بڑی عجلت میں کمرے میں قدم رکھا وہ کروٹ کے بل لیٹی انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے دراز کھول کر ایک پیکٹ باہر نکالا اور واپس جانے لگے۔

"کیا میں اندر سے دروازہ بند کرسکتی ہوں؟۔ مین سونا چاہتی ہوں"

"بہت شوق سے۔" سرد سا جواب ملا

"وہ اٹھ کر ان کے نزدیک چلی آئی۔ "کیا میں آپ کے بزنس میں آپ کا ہاتھ بٹا سکتی ہوں؟ کم از کم آپ کا آدھا بوجھ تو کم ہوجائے گا"۔

"تم اس کی اہل نہیں ہو۔"

"رات کے وقت کی اس مصروفیت یا "اوور ٹائم" کا کوئی نام تو ہوگا؟۔"

جواد بصیر نے نازک سی نازنین کو دیکھا "ناز! ایک بات ہے غور سے سننا اور خوب غور کرنا تمہاری بہن ثریا بہت عقل مند عورت تھی.... میں سمجھا تھا تم بھی اس جیسی ہی ہوگی۔ مجھے کھوجی لوگوں سے نفرت ہے سمجھیں؟"

جواد بصیر کا یہ نیا روپ تھا جو آپا نے نہیں بتایا تھا۔ وہ اس واقعے کو ازدواجی زندگی کی ایک کڑی تصور کرکے خاموش ہوگئی تھی۔ اس واقعے کے ٹھیک ایک ہفتے جب نیند کی شدت سے جمائیاں لیتی اپنے بیڈ روم کی سمت آرہی تھی تو اس نے کچن میں بٹلر کو ہنوز مصروف پایا۔

"بھئی اب کیا کررہے ہو؟۔"

"بلیک کافی تیار کررہا ہوں میڈم، صاحب کے دوست آئے ہیں۔"

"دوست! ہونہہ دوست کے ساتھ کتنا خوش کن سا تصور ابھرتا ہے بھلا جواد بصیر کا کوئی دوست ہوسکتا ہے۔ جب کہ مسکراہٹ دوستی کی کنجی ہوتی ہے جو جواد بصیر کے پاس ہے بھی تو محض جوابی، سرسری، احساس اتار، ہوگا کوئی پارٹنر کرارے نوٹوں کا آسرا۔" اس نے تلخی سے سوچا تھا۔

"یہ تم ٹرالی ادھر کیوں لے جارہے ہو؟" وہ حیران ہوئی

"رات کو یہ لابی بند ہوجاتی ہے میڈم۔" وہ اسے ایسے بتا رہا تھا گویا وہ کسی "کمپلیکس" کا افتتاح کرنے آئی ہو، جیسے یہ اس کا گھر نہ ہو۔ "بند ہوتی ہے تو کیا کھل نہیں سکتی وہ جھلا ہی تو گئے۔

"حکم نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"عجیب بے رحم آدمی ہے، عام گزر گاہ کو بند کرکے راتوں کو نوکروں سے اپنے قلعے میں پریڈ کراتا ہے۔" اس کی طبیعت مکدر ہوگئی۔

ویسے تو کوٹھی کی بناوٹ اس طرح کی تھی کہ تین طرف سے راستے ڈرائنگ روم کو جاتے تھے مگر جس راستے سے بٹلر جارہا تھا، وہ راستہ تو بہت پیچیدہ تھا۔ وہ چپ چاپ اندر آگئی اور کروٹیں بدلتی رہی مگر چین نہ آیا تو اٹھ کر پھر باہر آگئی بٹلر غالباً" اپنی رہائش گاہ میں جاچکا تھا وہ اسی راستے سے جس راستے سے بٹلر کو جاتے دیکھا تھا ڈرائنگ روم کی طرف چلی، کھڑکیاں بند تھیں جن پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اسے سخت کوفت ہوئی وہ دروازے کی سمت آئی "کی ہول" سے آنکھ لگا کر اندر جھانکا ایک نوجوان سا لڑکا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جواد بصیر اسے سمجھا رہے تھے اب اس نے آنکھ کی بجائے کان "کی ہول" سے لگادیا اس نے بہت کچھ دیکھا...... وہ اسے آتشیں اسلحہ مع فہرست کے دے رہے تھے۔ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے کامران! لیکن آرزو اس کی بھی ماں ہے یاد رکھو، وفاداری کسی بلاک سے نہیں پیسے سے ہے جو ہماری آرزوؤں کی تکمیل کرتا ہے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کرنے والوں کو یہ ہمارا جواب ہے آرزو کی تکمیل کوئی گناہ، کوئی جرم نہیں یہ جسم ہمیں ایک مرتبہ استعمال کے لئے ملا ہے۔ ہمیں اس کے تقاضے پورے کرنا چاہیئں۔"

"سر! پہلی مرتبہ تو جھجک ہوتی ہے نا۔" نوجوان جھجکا

"ہاں یہ درست ہے، دانے دانے کو ترسنے والے "بوری" کیسے برداشت کرلیں مگر بے فکر رہو

تم اکیلے نہیں ہو یاد رکھو! کامیابی کی صورت میں تم ہمارا وجود ہی ہو' ناکامی کی صورت میں ہمیں نہیں معلوم تم کون ہو؟۔" جواد بصیر کا لہجہ ایک بار پھر سرد ہو گیا

"کامران! یہ آرٹ ہے' ہمارے مشرقی بلاک کے مرکز میں باقاعدہ یونیورسٹی ہے جو دہشت گردوں کو باقاعدہ ڈگری کے ساتھ فارغ التحصیل کرتی ہے۔"

نازنین کے پاس تلے سے زمین سرک رہی تھی۔ جواد بصیر بولے جا رہا تھا "ہمیں ترقی پسند بلکہ ترقی پرست تازہ دماغ چاہئیں تم اپنے ساتھیوں کو اٹھتے بیٹھتے ٹٹولا کرو یہ اپنے پاس رکھو۔

"یہ کیا ہے سر؟۔"

"یہ سرخ انقلاب کا نشان ہے' ہماری رکنیت کی چابی۔"

"تھینک یو سر۔"

"لوگ تو ویسے بھی مرتے رہتے ہیں' کامران کسی کے کام ہی آجائیں تو کون سا گناہ ہے۔"

"سر! یہ "ریل" کی آمد سے صرف تین منٹ پہلے رکھنا ہے نا۔"

"ٹرین کی آمد سے صرف تین منٹ پہلے معاوضہ پچاس ڈالر فی کس۔" جواد بصیر کے لہجے میں بھیڑیا غرا رہا تھا۔

"سر! یہ کیسے پتا چلے گا کہ کتنے آدمی.....؟۔"

کامران نے پچاس ڈالر فی کس کے حساب سے اندازہ لگانا چاہا۔

"اگلی صبح اخبار پڑھ لینا' تعداد لکھی ہوتی ہے خبر میں۔"

"یہ کام کب کرنا ہے سر؟۔"

"فون پر بتادوں گا۔"

"ہمارے سامنے شاندار مستقبل ہے اگر ہم اس خطے سے ترقی پسند دماغ اکٹھے کرلیں تو......"

نازنین نے کی ہول سے کان ہٹالیا اور شل اعصاب سے بچوں کے بیڈ روم میں آگئی۔ اس نے متوحش نظروں سے دونوں بچوں کو دیکھا اور سوچنے لگی ترقی پسند ذہن' شاندار مستقبل' سرخ انقلاب' سنہرے انقلاب تو محض خواب ہوتے ہیں مسٹر جواد بصیر جب تک خون کا رنگ سرخ ہے

انقلاب سرخ ہی ہوں گے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کبھی انقلاب سے پہلے سرخ چھینٹے پڑتے ہیں کبھی انقلاب کے بعد آج تک نیلا پیلا' ہرا' بھورا' انقلاب نہیں آیا انقلاب تو سرخ ہی ہوتے ہیں اکثر یہ کوئی انوکھی اصطلاح نہیں ہے جواد بصیر! یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہو گیا؟" اے خدا میں کہاں اتنی اہم آزمائش کے قابل تھی۔ میں جن دماغوں کو دن بھر جنہیں کہتی ہوں بناؤ' تم انہیں رات کو کہتے ہو مٹاؤ' وہ ذہن تمہارے گھر میں پرداخت ہو رہے ہیں جواد بصیر! مگر میں انہیں کسی انقلاب کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی

"تمہاری بہن تم سے زیادہ عقلمند تھی۔۔" جواد بصیر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے' ہاں جواد بصیر! شاید اس لئے کہ میری کوئی حریف "عطیہ" نہیں ہے۔

وہ صبح کلاس میں بچوں سے ملک دشمن سرگرمیوں پر ہی تو بات کررہی تھی۔ کتنی چاہ سے انہیں سمجھا رہی تھی۔ کہ آپ اگر کوئی ننھا سا پودا لگائیں' اسے پانی دیں' پروان چڑھائیں' جب اس پر پھل پھول کا موسم آئے تو کوئی اسے کاٹ ڈالے کیا گزرے گی آپ پر؟ آپ لوگ تو ہمارے ننھے سے پودے ہیں جن پر بہار آرہی ہے۔

تمام کلاس خاموش ہو گئی تھی گویا سب نے کٹنے والے پودے کے مالی کا دکھ محسوس کرلیا تھا۔

"اسی لئے آپ کو سمجھایا جاتا ہے کہ دور طالب علمی میں تمام تر پرخلوص توجہ اپنی تعلیم پر دیجئے اپنے ہنر کو کمال کیجئے۔ خوشحالی تو آپ ہی آپ پھوٹ پڑے گی۔"

اسے معلوم نہیں تھا کہ گرگوں کا گرگا اس کے وجود کا حصہ ہے......اسے اپنے وجود سے کراہیت آنے لگی۔ تمام رات اس نے کانٹوں پر بسر کی تھی کہ فیصلے سے پہلے کا ذہن دہکتا تنور ہوتا ہے

"میں نے تم سے زیادہ احمق عورت آج تک نہیں دیکھی۔۔" جواد بصیر نے سلاخوں کے پیچھے سے برقعے میں لپٹی نازنین کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ وہ زخمی ناگ ہو رہے تھے۔" جواد بصیر! آپ شاید ٹھیک کہتے ہوں مگر مجھے آپ سے اور خود سے بھی زیادہ اس سرزمین کے بچے اہم محسوس ہوتے ہیں' کیا ہماری قبریں فاتحہ اور پھولوں کی آرزو مند نہیں ہوں گی؟ میں پھول چڑھانے والے ہاتھوں

کو کیسے کٹتا دیکھوں؟" "میں تمہارا سہاگ ہوں نازنین" "سہاگ تو وہ کمزور رشتہ ہے جس کا چہرہ بدل بھی جاتا ہے لیکن ماں دوبارہ نہیں ملتی جواد بصیر' یہ سرزمین ہماری ماں ہے' میں آپ سے ایک سوال کر رہی ہوں' کوئی اپنی ماں کی چادر بھی اتارتا ہے؟"۔

کستوری

نام اس کا کستوری بے سبب نہیں پڑا تھا' اس عرفیت کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اسے غیر معمولی طور پر خوشبوؤں میں گھرے رہنے کا جنون تھا پانچ کے سن تک ہنس کر ڈالی گئی مگر جنون سوا تر ہوتا گیا پھولوں کا استعمال' دیسی عطروں کا استعمال ٹالکم پاؤڈر' یعنی ہر وہ خوشبو جو دسترس میں آسانی سے ہوتی۔

انہی حرکتوں کی وجہ سے ماں نے اور دادی نے کستوری کا خطاب دیا تھا ایسا طنزیہ خطاب جو مائیں بیٹیوں کو جل کر دے دیا کرتی ہیں۔ جیسے بیگم صاحبہ مہارانی وغیرہ انہوں نے تو خیر ایک دو بار ہی کہا ہوگا' جل کر دوسروں کو ایسا پسند آیا کہ عرفیت ہی بنا چھوڑا۔

جب اسے "خطابا" کہا وہ بہت ہی چھوٹی تھی ہوش سنبھالنے پر بھی اس نے کبھی عجیب وہ غریب نام کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ بالکل اسی طرح جس طرح "ببن" اور "چھکن" نے کبھی اپنے ماں باپوں سے نہیں پوچھی ہوگی کہ انہیں ببن اور چھکن کیوں کہا جاتا ہے؟"

ایک دن دادی ہی نے بڑے موڈ میں آکر اسے بتادیا تھا کہ کستوری ایک ایسی خوشبو ہوتی ہے جو سونے سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ یہ کستوری ہرن سے حاصل کی جاتی ہے۔

جمال اور جوبن آئینے کی گواہی پر کیا کم اتراتا تھا۔ یہ جان کر تو پاؤں زمین پر نہ پڑتے کہ نام بھی ایسا قیمتی۔

روایتوں و قدروں کے چیتھڑوں کو پیوند کی طرح زندگی سے چپکائے رہنے والا یہ گھرانہ اس ملک

کے بڑ60 ساٹھ خاص گھرانوں میں سے ایک تھا..... لڑکیاں برقعوں کے غلافوں میں لپٹی جاتی تھیں نو عمری کے جذبات وہ خود غلافتی تھیں چوتھا نمبر تھا کستوری کا بہنوں میں سترہ اٹھارہ کے سنوں میں سب اپنے حقیقی انجاموں کو پہنچ گئیں۔ کستوری سدا کی سرکشیدہ سہی تھی تو روائتی حیادار لڑکی' اسے خوشبوئیں پسند تھیں وہ ہر طرف مرخوشبوئیں بکھیر رکھتی تھی۔ اسے گیت پسند تھے۔ سارا دن دھیمے سروں میں ریڈیو بجایا کرتی۔

الوہی جذبوں میں گھر کر کبھی گنگناتی تو ماں یا دادی کی ہنکار سنائی دیتی وہ آواز روک لیتی۔ اس دم اسے احساس ہوتا کہ اس کے قدرتی جذبوں کا گلا گھونٹا جا رہا ہے وہ کستوری تھی اس کے خواب بھی خوشبو کی طرح آزاد تھے۔

اس کی سہیلی وپڑوسن بلو کی بارات آنے میں آدھا گھنٹہ تھا وہ سردیوں کی دھوپ میں بال سکھانے چھت پر آئی تھی..... بال سکھانے آئی تھی سامنے برابر والے گھر کی چھت کے اس پار کھڑا مالی اس کے جذبوں کی آبیاری کو کھڑا تھا وہ بال سکھا رہی تھی انگلیوں سے سلجھا رہی تھی۔ ساری خدائی سے بے نیاز..... وہ مہ کامل تھی اس کے وجود کا ہر حصہ مہ پارہ..... وہ ششدر کھڑا رہ گیا وہ کیسی بے خبر تھی وہ تو توجہ چاہتا تھا اس نے پیتل کا گلدان زمین پر گرا دیا۔ ٹن ٹن..... ٹن ..... پختہ فرش پر گرتے ہی گلدان نے جبرو زیادتی کی دہائی دی کستوری چونک پڑی اس نے ادھر ادھر دیکھا..... سامنے منڈیر سے نیچے جھانکتے نوجوان کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی کہ دن میں ستر بار اس کی چھت یاترا ہوتی تھی پہلے کبھی نہیں دکھائی دیا..... یہ نوجوان..... اس کے ہونٹ نیم وا تھے اور آنکھیں پوری کھلی ہوئیں نوجوان ایک دم پلٹ پڑا اور کستوری پر ایک بھرپور نظر ڈال کر اندر چلا گیا وہ نگاہ وہ تھی کہ جو غالب کی محبوبہ کا تیر نیم کش کہلائی تھی۔ کستوری کا دل دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ وہ خود کو سنبھالتی نیچے چلی آئی تھی۔ اماں نے ہزار دفعہ کی دہرائی بات ایک مرتبہ مزید دہرائی......

نامراد چھت پر بال کھول کر نہ پھرا کر کنواری لڑکیوں کو آسیب چمٹ جاتے ہیں اماں سامنے بلو کے کرائے دار تو چھت پر رہتے ہیں۔ سات بیٹیاں ہیں ان کی..... کھلی چھت پر سوتے ہیں سب ان کی بیٹیوں کو تو کسی آسیب نے نہیں سونگھا آج تک..... حالانکہ تین چار کو لے جائیں تو اچھا ہی ہو' کم از

زکم ان کی اماں آپ کے پاس سات جوان بیٹیوں کا رونا تو نہیں روئیں گی۔

اسے اماں کی نصیحت پر تاؤ آ گیا تھا۔

ارے دیکھو زبان کیا ہے ڈنڈا ہے ہاتھ بھر کا.....

روتی ہے وہ اولاد جو بڑوں کا کہا نہیں مانتی۔

اماں کو گویا پھر چابی مل گئی وہ عاجز آ کر دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔

فیروزی لچکے سے سجا کرتا پائجامہ اور خوبصورت ڈوپٹہ پہنے وہ شامیاں سے باہر کھڑی تھی ابھی ابھی دلہن کی رخصتی عمل میں آئی تھی۔ عزیز سہیلی کی رخصتی پر رو رو کر اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ ابھی تک سوں سوں کر رہی تھی۔

سامنے والے گھر کا گیٹ کھلا اور شام والا نوجوان موٹر سائیکل سمیت باہر آیا کستوری پر نگاہ پڑتے ہی چونک پڑا پھر بڑی شائستگی سے مسکراتا کستوری کو یوں محسوس ہوا گویا چکی کے دو پاٹوں کے بیچ اس کی جان رکھ دی گئی ہو۔ وہ لپ جھپک اندر بھاگ گئی غریب لڑکی کا رومانس آنکھ مچولی سے شروع ہوتا ہے۔ آنکھ مچولی شروع ہو گئی تھی۔

بیٹیوں کے ہونے کا کوئی دکھ نہیں۔ نصیب اچھا ہو اور نیک ہوں تین بیٹیاں بیاہی ہیں میں نے بیٹیوں سے بڑھ کر سر اونچے رکھے میری بچیوں نے میری بچیاں تو جانیں ہی نہیں زمانے کی ہوا کس طرح کی ہے۔ اماں خلاف معمول آج بیٹیوں کے قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ اپنی دیورانی کے سامنے۔

مگر کستوری کو ان قصیدوں سے رمق برابر خوشی محسوس نہ ہوئی

ہونہہ..... ساری عمر بس دوسروں کی فکریں کرتے کرتے تباہ کر دو' اگر اپنے جذبات اپنی عمر برباد کر بھی دی تو کون سا ایمپائر اسٹیٹ پر جھنڈا گڑے گا.....

ماں نصیب کبھی کبھی بلاتا ہے بلائے تو چلا جانا چاہیے ورنہ وہ روٹھ جاتا ہے پھر ساری زندگی پچھتاتے گزرتی ہے اس کی سوچ اس عمر کے عین مطابق تھی جذباتی اور سطحی آنگن میں بہت جگہ تھی مگر وہ کپڑے سکھانے چھت پر گئی تھی ایک ایک کپڑے جھٹک جھٹک کر الگنی پر ڈالتی اتنے زور

سے جھٹکی ک ساری چوڑیاں قہقہے لگانے لگتیں.....

اس نے اپنے جذبات اور بلاوے کے انداز چوڑیوں پر پرو دیئے تھے.....وہ کتاب ہاتھ میں تھامے تھامے منڈیر تک چلا آیا.....وہ انجان بن گئی۔ مگر اب لہرا لہرا کر کپڑے ڈالنے لگی تھی ایک مرتبہ بھی پلٹ کر پیچھے نہ دیکھا تھا اور بالٹی اٹھا کر ٹھک ٹھک کرتی نیچے آ گئی۔

اس کا ذہن چھت کی طرف ہی متوجہ رہنے لگا تھا شام کو ابا کو چائے بنا کر دی اور اماں سے کہ وہ کپڑے اتارنے اوپر جا رہی ہے۔ وہ اوپر پہنچی تو برابر والی چھت پر بچے بسنت منا رہے تھے۔ اس کا دل بجھ سا گیا وہ بے دلی سے کپڑے کھینچ کھینچ کر اتارنے لگی۔ اسی دم اسے ایک بچے کی آواز آئی.....

آپا..... آپ کے روشندان سے پتنگ اٹک گئی ہے ذرا نکال دیں۔

وہ کپڑے ٹوٹے پھوٹے تخت پر رکھ کر روشن دان کی سمت آئی اور پتنگ آزاد کر کے اونچائی سے چھوڑنے لگی.....

ایک دم اس کے کانوں کی لوئیں سلگنے لگیں۔ پتنگ اس کے ہاتھ میں تھی اور ڈور اسی نوجوان کے ہاتھ میں..... عجیب خوشگوار سے احساسات کے درمیان س نے پتنگ چھوڑ دی۔ اٹھارہ زینے طے کرنے کے جتن رائیگاں نہیں گئے تھے وہ شاد شاد سی نیچے چلی آئی' اماں نے اسے صبح بتایا تھا برابر میں جو نئے "آنز" آئے ہیں ان کے ہاں میلاد ہے شام کو بلاوا دے گئیں تھے خاتون خانہ۔' میں نے تو آج صبیحہ کے ہاں جانا ہے اس کی بچی دو دن سے اسپتال میں ہے تم ہو آنا۔

اور یوں وہ ہلکے گلابی سوٹ میں ملبوس سیاہ چادر ماتھے تک ٹکا کر جب وہاں پہنچی تو وہ غالباً" کہیں جانے کے ارادے سے موٹر سائیکل پر بیٹھا تھا کستوری کو دیکھ کر چابی گھمانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور اسے بڑے مہذب انداز میں اندر جانے کو کہا۔ اس کے سراپے کی طرح اس کی آواز بھی بہت جادو اثر تھی۔ وہ پلکیں جھکائے اندر چلی آئی۔ دو تین لڑکیوں نے بڑے اخلاق سے اس کا استقبال کیا سے بٹھایا۔

محفل میلاد بڑے باوقار انداز میں اختتام پذیر ہوئی' ہلکا پھلکا ریفریشمنٹ تھا وہ چائے کی پیالی کے ہلکے ہلکے سپ لے رہی تھی۔

اور وہ اس کے سامنے سے کئی بار گزرا وہ جان کر بھی انجان بنی رہی۔ وہ خود پسند لڑکی نہیں تھی بلکہ چاہے جانے کی خواہش رکھنے والی ایک باحیا اور بزدل لڑکی تھی ہزار چاہنے پر بھی اس کی سمت نہ دیکھ سکی کہ کہیں وہ ادھر ہی نہ دیکھ رہا ہو۔

جب وہ آتے وقت گیٹ پار کر رہی تھی تو وہ آہستگی سے گویا ہوا تھا۔ آتی رہا کریں.....

اور کستوری کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں جھلک پڑیں۔

یہ پہلی براہ راست ملاقات تھی۔

ایک چنگاری سلگی تھی۔ ایک رات بھڑک کر شعلہ بن گئی۔

اس نے منڈیر پر بازو جما کر اسے اپنانے کی آرزو بیان کی تھی۔ کستوری کی بھی یہی آرزو تھی وہ آنکھ مچولی سے بعد خود کو دلہن بنا دیکھنا چاہتی تھی۔ نہ کہ لمبے لمبے رومانس کے چکروں میں الجھانا چاہتی تھی..... اور اس روز خود اس کی آرزو سوہنی کا کچا گھڑا بن گئی جس کے سہارے اس نے سماج کے دریا کو عبور کرنے کا پختہ عزم کر لیا کہ "تو نہیں تو اور کوئی بھی نہیں"

وہ ایسے ہی چلی آئی تھی گھر والوں سے ملنے کہ "اس سے منسوب پیارے اسے بھی پیارے تھے۔

مگر گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا گھر میں صرف وہ ہی تھا طارق نے اسے دیکھا اور اسے بیٹھنے کو کہا مگر وہ گھبرا گئی تھی' تب اس نے لوہے کی کرسی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا.....

کستوری! بیٹھو ناں..... تھوڑی دیر ہی سہی.....

مجھ سے کیا ڈرنا.....؟

مگر وہ بیٹھی نہیں.....

گھر میں کوئی نہیں ہے میں چلتی ہوں..... وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

طارق نے مخصوص مہک کے مرغولے میں مقید سہمی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

اچھا تو پھر جاؤ... میں تمہیں قسمیں دے کر بھی بٹھا سکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا کستوری مجھے تمہاری محبت کے علاوہ تمہارا اعتماد بھی چاہیے

وہ واپس اندر چلا گیا۔

وہ محبوب تھا اب دیوتا ہو گیا تھا۔ کستوری کے جذبوں میں شدت آگئی تھی۔

اسے ناز تھا کہ اسے ایک "انسان" نے چاہا ہے اب تو اسے راتوں کو نیند بھی نہیں آتی تھی۔

جی چاہتا تھا بس جلدی سے وہ اس کی ہو جائے۔

جب بھی طارق کی ماں ان کے گھر آئی اس کا دل دھڑک جاتا کہ شاید آج وہ اسے مانگنے آئی ہیں مگر کوئی بات نہ ہوتی وہ بجھ سی جاتی۔ طارق سے وہ اتنی کھلی نہ تھی کہ جا کر اس سے پوچھتی تم لوگ مجھے مانگتے کیوں نہیں کیا رکاوٹ ہے کیا مجبوری ہے؟؟ مگر وہ سوچ کر ہی رہ جاتی۔

ایک روز معلوم ہوا کہ طارق اپنی ماں کے ہمراہ اپنی بیمار پھوپھی کی عیادت کو لاہور گیا ہے کستوری کے دن بوجھل ہو گئے۔ عشق میں تو دید ہی عید ہوتی ہے اس کی ایک جھلک اس کا منوں بوجھ دل سے سرکا دیتی تھی۔

ہر گاڑی کے ہارن پر وہ کھڑکی سے جھانکتی کہ شاید آگیا ہو مگر ہر مرتبہ مایوس ہوتی۔

آج جب وہ حضرت نوح کے زمانے کے کھڑکھڑ پنکھے کے نیچے سو رہی تھی اسے گلی میں ٹیکسی رکنے کی آواز آئی۔ اس نے ایک بار اٹھ کر باہر جھانکا ٹیکسی سے طارق اترا تھا پھر اس کی ماں' پھر اس کے بعد پھول دار چادر میں لپٹی ایک نازک سی لڑکی

طارق نے جب تک کرایہ ادا کیا اس وقت تک طارق کی ماں اس لڑکی کو لے کر اندر جا چکی تھی۔ طارق نے پرس پینٹ کی پچھلی پاکٹ میں ٹھونسا اور آہستہ روی سے اندر کی طرف مڑ گیا۔

کستوری کے جی کو قرار آگیا تھا وہ شام تک پیٹ بھر کر سوئی شام کو اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر چائے پی..... اسی دم اسے اماں کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تھا..... دادی تو پچھلے ماہ سے چھوٹے چچا کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ وہ باورچی خانے سے باہر آئی احساس ہوا بیرونی دروازہ باہر سے بند ہے ابھی وہ الجھ ہی رہی تھی کہ اماں آگئیں۔

سر سے چادر اتار کر رکھ کر بولیں..... "لو بھلا اکلوتا لڑکا تھا ان کا کیا کیا ارمان نہیں ہوں گے۔ مگر قسمت کے آگے کس کی چلی ہے بھاوج ہو تو طارق کی ماں جیسی۔

میاں کو مرے تیسرا برس ہے مگر سسرال والوں سے اسی طرح محبت ہے جیسے اس کی زندگی میں ہوگی۔ نند کی بیٹی بیاہ لائی' لڑکی بھی خیر سے دبری نہیں ہے.....

کستوری کے پاؤں تلے زمین کا یعنی.....

کون اماں!..... اس کی آواز میں لرزش تھی۔

ارے وہ طارق کی پھوپھی بیمار تھی ناں اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ طارق کی ماں سے منت کی کہ وہ اسے اپنی بہو بنا لے ورنہ لڑکی کا کیا بنے گا۔ طارق کی ماں بھی فرشتہ ہی ہے نند کے سامنے ہی بیٹے کا نکاح کر دیا..... طارق کی دلہن دیکھنے گئی تھی۔ اچھی ہے لڑکی خدا نصیب اچھا کرے۔ اماں باورچی خانے میں جاتے جاتے دعائیہ انداز میں بولیں۔

اور کستوری..... پتھر سی ہو کر رہ گئی..... خواب بھڑ بھڑ جلے اور سارا وجود دہک اٹھا۔

وہ چھت پر مغرب کی نماز پڑھ کر آئی تو جسم بری طرح تپ رہا تھا رو رو کر آنکھیں متورم ہو گئی تھیں۔

مقدر نے ززندگی کے سنگ میل کو ایک ٹھوکر سے لڑھکا دیا تھا وہ زندگی راستہ بھول گئی۔

دوائیوں سے اور مناسب دیکھ بھال سے بخار تو اتر گیا تھا مگر اسے چپ لگ گئی تھی۔ رات کو اتنا روتی تھی کہ صبح پپوٹے سوج چکے ہوتے..... دادی بھی آگئی تھیں۔

بلو کی اماں جاں نے اس کی اماں کو یقین دلایا کہ یہ ساری علامتیں "سائے" کی ہیں اس پر اثر ہو گیا ہے۔

اماں کو جھٹ یقین اس لئے آگیا کہ وہ جانتی تھیں کہ وہ ہر وقت خوشبوؤں میں بسی رہتی تھی۔

"پھر شام کے وقت ننگے سر چھت پر جایا کرتی تھی....."

آمنے سامنے دونوں گلیوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ کستوری پر اثر ہو گیا ہے۔

کستوری کے چندر ماہ مکھڑے کے سب دیوانے تھے اس کی پر اخلاق مسکراہٹ پر سب نثار تھے۔ وہ محلے کی ہر دل عزیز لڑکی تھی' سب اپنے اپنے ٹوٹم..... منتر آزمانے لگے۔ گلے میں بازوؤں میں'

پلنگ کی پٹیوں میں..... غرض کہ تعویذ ہی اوڑھنا بچھونا بنادیئے گئے وہ اسی طرح گم صم تھی۔ رات کو اماں کمرے میں دھونی دیتیں کمرہ ایک مزار کا منظر پیش کرنے لگتا۔

"ائے ہئے..... ایسی نیک پردہ پوش لڑکی جس پر نہ کوئی میلی نگاہ پڑی ہوگی نہ سایہ..... خوشبوؤں کی دیوانی کو یہ خوشبوئیں ہی لے ڈوبیں..... اسی لئے تو کہتی ہیں ان لڑکیوں کو..... مگر آج کل یہ لڑکیاں گردانتی کہاں ہیں ان باتوں کو....."

صبح شام محلے کی خواتین کے اجلاس ہوتے تھے۔ جو بھانت بھانت کی بولیاں بولتیں کوئی تعویذ لاتیں کوئی پڑھا ہوا پانی..... کوئی اپنے پیرو مرشد

رو رو کر کستوری کی آواز بھاری ہوگئی تھی۔ ایک روز بیزار ہو کر وہ الٹ کر پڑی اماں کیا تماشہ بنا رکھا ہے' پھر پھوٹ پھوٹ رو دی۔ سب عورتوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا دیکھی..... آواز بھی بدلی ہوئی ہے۔ یہ تو کھلی نشانی ہے آواز بھاری ہوجاتی ہے' میری اماں کی پھوپھیا ساس کی دیورانی پر بھی اسی طرح کا.....

ہونہہ..... تمہاری پھوپھی' ساس کی دیورانی تو دیوانی ہوگی پھوپھیا ساس کے دیور کے ہوتے ہوئے بھی اس کے طور یہ تھے..... چھی.....

کستوری کروٹ بدل کر سوچتی۔

روز ہی کوئی نہ کوئی عیادت کو آجاتا تھا..... کستوری نے خود کو بہت سنبھالا تھا مگر رات کاٹے نہیں کٹتی تھی۔

اس کے پختہ خواب تھے..... جن سے وہ سر پھوڑتی تھی..... اتنے پختہ خواب..... کہ طارق دولہا بن کر بارہا اس کے آنگن اترا تھا..... دروازے پر ساتوں پہر شہنائیاں بجتی تھیں وہ سہاگن پہلے بیراگن بنی تھی اس شیشہ لڑکی کے دکھ اتنے بڑے تھے کہ تصور میں نہیں سما سکتے تھے۔

طارق کی بیوی طارق کی بہنیں کئی بار اس کی عیادت کو آئیں تھیں۔ موت کا جلایا کیا ہوتا ہے اس نے کنوار پن میں محسوس کیا تھا جب تخت سے تختہ ہوتا ہے تو ایک بادشاہ کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اس ڈربہ نما گھر کی اس نیم خواندہ لڑکی جو امپریل و سوشل ازم و نیشنل ازم کی اصطلاحوں سے

ناواقف تھی خوب سمجھتی تھی۔ بعض دکھ پڑھ کر محسوس نہیں ہوتے..... دنیا اس کا دکھ بٹا رہی تھی۔ اس پر سایہ بتا رہی تھی ہمدردی کر رہی تھی۔

اگر یہی عورتیں اسے مسمریزم کر کے ہپناٹائزڈ کر کے اس کی ذہنی پرت پرت پڑھ لیتیں تو ماتھا پیٹ کر اپنے اپنے گھروں کو سدھارتیں..... جس طرح اولاد صرف اس کی ہوتی ہے جس کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح دکھ بھی صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جس کے قلب سے جاری ہوتا ہے۔ یا پھر وہ جو اسی طرح کا دکھ اٹھا چکا ہو.....

اب عورتوں کو کون سمجھائے..... کہ جب وہ اس قاتل عمر میں ہوں گی تو ان کے گھر میں زینے نہیں ہوں گے اگر زینے ہوں گے تو پڑوس میں کوئی طارق نہیں ہوگا.....

اگر طارق بھی ہوگا تو تمہارا قلب "جاری" نہیں ہوا ہوگا۔ اس نے خود کو بہت حد تک سنبھالیا تھا..... اور جھلا کر بولی! اماں یہ کیا تماشہ! صبح و شام ہوتا رہتا ہے کوئی نہیں ہے مجھ پر سایہ وایہ!..... کیا کسی کی طبیعت خراب نہیں ہوتی.....؟

اماں اور دادی نے اسی وقت سجدہ شکر ادا کیا۔ اماں اور دادی سمیت بے زبان سیدھے سادھے ابا بھی شیخ امام ضامن کے پیرو مرشد کے قائل ہوگئے' جن کی جھاڑ پھونک سے اس قدر "افاقہ" ہوا تھا.....

......*

طارق کی امی کے ماموں لکھنؤ ہندوستان سے پاکستان "وزٹ" پر آئے تھے۔ حکمت کے آبائی پیشے سے منسلک تھے۔ پاکستان میں مقیم اپنے رشتے داروں کے لئے ہدیئے و تحائف لائے تھے لیکن سب سے بیش قیمت تحفہ انہوں نے اپنی سگی بھانجی یعنی طارق کی امی کو مرحمت فرمایا تھا..... انہوں نے شیشے کی چھوٹی سی ڈبیہ طارق کی امی کو پیش کی' جب انہوں نے کھولا تو سارا کمرہ مہک اٹھا..... چھوٹی سی مشک نافہ کی ڈلی تھی انہوں نے تھوڑی سی توڑ کر ایک ڈبیہ میں رکھ کر اپنی بہو کو بھی دی..... ساتھ ہی بتایا کہ اسے کستوری بھی کہتے ہیں..... سونے سے زیادہ مہنگی ہوتی ہے۔ پھر پلٹ کر اپنے ماموں کا شکریہ ادا کیا' انہوں نے بہت خوب صورت اور قیمتی تحفہ دیا ہے اور بہو کو تلقین کی کہ

اسے حفاظت سے رکھے۔

......*

وہ خود بھی بہت مضطرب تھا..... سب کچھ اس کے ساتھ اچانک ہوا تھا.....وہ لاابالی اور ہرجائی نوجوان نہیں تھا خواب اس کے بھی پختہ تھے۔ کستوری کی علالت کا سن کر بار بار دکھ و ندامت محسوس کی تھی۔ اب بھی اس کا جی چاہتا تھا وہ اسے دیکھے۔ وہ چھت پر آئے چوڑیوں کے ساز بجائے ایسی الوہی موسیقی سنے، جسے نصیب ور سنتے ہیں اور اس پر ایسی سلگتی نظر ڈالے کہ وہ بھڑ بھڑ جلتی سارے زینے دو تین جستوں میں پار کر جائے۔

رات بہت بیت گئی تھی۔ اس نے منڈیر پر سفید آنچل لہراتا دیکھا یقیناً" وہ کستوری تھی وہ آگے بڑھ آیا۔

پہلی مرتبہ اس نے اسے منڈیر سے پکارا.....

"کستوری......!!۔"

"وہ اسی طرح کھڑی رہی.....۔"

"کستوری......۔"

"ادھر آؤ ورنہ میں ادھر آجاؤں گا۔"

کستوری نے جھکا سر اٹھایا اور جیسے خواب میں چلتی ہوئی منڈیر کے نزدیک آگئی' سفید کپڑوں میں وہ مردوں کی طرح ٹھنڈک دیتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی بے آباد اور بے آواز تھی کہ ایک لمحے تو طارق کو بھی خوف سے جھرجھری آگئی.....

کستوری.....!! انسان تو بے وقوف ہے اپنے فیصلے خود کرنے کی کوشش کرتا ہے جب کہ فیصلے تو ہو چکے ہیں.....تم خود کو سنبھالو..... کستوری..... ہمارے ہاں یا تو حکومت کی چلتی ہے یا جاں بلب لوگوں کی یا مرحومین کی.....میں زندہ تھا اس لئے میں کچھ نہیں کرسکا اگر پھوپھی سے پہلے میں لب گور ہوتا تو شاید تمہیں پالیتا۔

اس کا سر سچ آدمی کی طرح جھک گیا اس کی آواز شریف آدمی کی طرح دھیمی ہو گئی۔

عجب سفر تھا اس محبت کا.....درمیان میں نہ اقرار محبت نہ اعتراف محبت' احساس محبت کی کڑی سے احساس ندامت و اعتراف جرم کی کڑی مل گئی تھی.....

طارق نے دیکھا کستوری کی پتھر آنکھوں سے جھرنے پھوٹنے لگے ہیں.....اس سے پہلے کہ جھرنوں سے آواز پیدا ہوتی وہ پلٹ گیا اور تیزی سے زینے طے کر گیا..... اپنے کمرے میں آیا تو مرحومہ پھوپھی کی التجا غالباً" پیٹھ موڑے سو رہی تھی.....وہ خاموشی سے لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کی بیوی الماری کے پاس کھڑی تھی.....

"سنیئے..... آپ نے کبھی کستوری کی خوشبو سونگھی ہے؟۔" طارق نے چونک کر زیب النساء کی شکل دیکھی وہ مسکرا رہی تھی طارق کو مسکراہٹ زہر آلود محسوس ہوئی.....

اس کی شریانوں میں جو ابھاٹا اٹھنے لگا......وہ اس کے نزدیک آکر تپ کر گویا ہوا..... زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو جو کہنا چاہتی ہو کھل کر کہو..... کس کس سے کہو گی......؟ نباہ! تم نے میرے ساتھ کرنا ہے اس لئے کہ زبردست میرے سر منڈھ دی گئی ہو.....ورنہ..... آج تمہاری جگہ کستوری ہی ہوتی.....وہ جتنی حسین ہے اتنی ہی نیک ہے' خبردا! جو تم نے اس کے بارے میں کبھی الٹی سیدھی بات منہ سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس کا مطلب ہے میں جہاں جہاں جاتا ہوں اس گھر میں تم میرا پیچھا کرتی ہو..... شرم نہیں آتی تمہیں......؟"

وہ بری طرح بھڑک اٹھا تھا۔

زیب النساء ہکا بکا منہ کھولے ایک ٹک طارق کی صورت دیکھ رہی تھی۔ مشک نافہ کی ڈبیہ اس کی مٹھی میں بند تھی۔ وہ تو فرط شوق سے خاوند کو یہ قیمتی خوشبو سنگھانے آئی تھی۔ کتنی دیر سے لیٹی وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ اسے شعلہ بار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

"....وہ.....ماموں عنایت اللہ یہ..... یہ اس نے مٹھی کھول کر ڈبیہ آگے کر کے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ہر چند کہ ذہن اب اس کا کھولنے لگا تھا۔ مگر طارق تو دل ہی دل میں اسے مکار جاسوسہ کا خطاب دے کر تکیہ اٹھا کر باہر نکل گیا.....

زیب النساء کستوری کی ڈبیہ ہاتھ میں تھامے گم صم کھڑی رہ گئی تھی۔ اسے کستوری کا "جن" نظر آگیا تھا ایسے ایسے ٹوٹم..... منتر اس پر منکشف ہوئے تھے کہ اس کا جی چاہا ابھی جا کر کستوری کی جھاڑ پھونک کر آئے..... مگر تھوڑی دیر کی گہری سوچ کے بعد اس نے کستوری کی ڈبیہ کپڑوں کی تہہ کے نیچے دفن کر دی اور خاموشی سے پلنگ پر آ کر لیٹ گئی۔